عورت کا گناہ

فارغ بخاری

گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور

عورت کا گناہ

فارغ بخاری

گوشۂ ادب • چوک انارکلی • لاہور

بار چہارم　　　سنہ ۱۹۵۵ء　　　قیمت عہ/۸

معصُوم رُوحوں کے نام!

جو مرد کی بوالہوسی پر خاموش آنسو بہاتے ہُوئے انتہائی وفاشعاری کے ساتھ آخری سانس کی بھینٹ چڑھا گئیں!!

عرضِ ناشر

پہلا دوسرا تیسرا ایڈیشن نہایت قلیل عرصہ میں ختم ہُوا، ہم اہلِ ذوق کے ممنونِ احسان ہیں کہ انہوں نے ہمیں اس تھوڑے ہی عرصہ میں طبع چہارم کے پیش کرنے کا شرف بخشا۔

ہیں تو یہ چند افسانے،

لیکن ہندوستانی عورت کی سوگوار زندگی کے مختلف مناظر! اور اخلاقی اصول کی اشاعت و ترویج!!

ہر افسانہ ایک خاص مقصد اور نتیجہ لئے ہُوئے ہے۔ اگر اسے "آئینۂ عبرت" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

مُبارک

مندرجات

حقائق

ابتدائے آفرینش سے حق و باطل میں آویزش چلی آتی ہے۔ نور و ظلمت میں ازلی کشمکش ہے۔ نیکی و بدی شروع سے دست و گریباں ہیں - یہ سلسلہ کب ختم ہو، کوئی اس کے متعلق پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ تاہم اتنا ضرور مترشح ہوتا ہے کہ جب تک صفحۂ ہستی پر ذی روح مخلوق باقی ہے۔ یہ سر بھیڑ جاری رہے گی -

اگرچہ ان کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر ان میں سے ہر ایک وحدت کی صورت میں بے مقصد۔ لاحاصل اور غیر ضروری ہے رات کی بھیانک تیرگی کے بعد ہی دن کی روپہلی روشنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کانٹوں کی اذیت برداشت کرنے پر ہی پھول کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ اور خزاں کے سونے اور بے کیف ایام گزرنے پر ہی عروس بہار کی نکہت آفرینی، طرب خیز و دلفریب ہوتی ہے۔ ورنہ دائمی روشنی اور جاودانی بہار کی کوئی اہمیت نہ رہے۔ اور وہ بجائے راحت بخش و روح افزا ہونے کے

خشک و خام محسوس ہونے لگیں۔

جس طرح خزاں کے بعد بہار اور رات کے بعد دن سکون آمیز ہے اُسی طرح دُکھ، درد، رنج اور کلفت کے بعد راحت و آرام میں بھی لُطف بے نہایت ہے پابندی کے بعد رہائی اور غلامی کے بعد آزادی میں ایک خاص حظّ ہے۔ جدوجہد اور سعیٔ و کوشش کے بعد کامرانی میں ایک کیف عجیب ہے اَور حقیقت میں اسی کا نام زندگی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حد اعتدال سے تجاوز کرنے اور غرہ بیجا میں پھنس کر اپنے جامہ سے باہر ہونے پر ہر عروج کو زوال اور ہر بلندی کو پستی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

افراد اور اقوام کا عروج و زوال ان کی حیثیت اور وزن کے مطابق مقرر ہے۔ اگر افراد اپنی بے اعتدالیوں کے باعث دنوں میں زوال آشنا ہوتے ہیں۔ تو اقوام صدیوں میں۔

تخلیق عالم سے آغاز دور تمدن تک کی وسیع مدت عورت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ مرد اس کی پرستش کرتے اور اسے دیوی خیال کرتے تھے

لیکن آخر اسے زوال پذیر ہوتا پڑا - مرد کو اقتدار نصیب ہوا۔ عورت کی وقعت گھٹتے گھٹتے آج اس حد تک پہنچ گئی کہ اسے انسان بھی نہیں سمجھا جاتا۔ مرد کا اقتدار اس قدر بڑھا کہ وہ اس کا خداوند اور پروردگار سمجھا جانے لگا۔ اس انتہائی اقتدار نے اسے مجنوں بنا دیا۔ اور وہ ایسی ایسی قباحتوں میں پڑ گیا جو انحطاط کے لازمی آثار ہیں۔

عالم انسانیت اور خصوصاً مشرق میں "عورت" کے ساتھ جو ظلم روا رکھا جاتا ہے اور جو تغافل برتا جاتا ہے۔ اسے ہر حساس انسان محسوس کرتا ہے۔ لیکن مقام تعجب ہے کہ اس کے باوجود مرد کی بوالہوسی اور خود غرضی اس کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی و غمگساری کا اظہار تک خلاف مصلحت سمجھتی ہے۔

اور اس تہذیب و تمدن کے دور میں بھی اس کی جا بجا چیرہ دستیوں سے عورت کی گوناں گوں مشکلات میں بجائے کمی کے روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مرد کے وضع کردہ قوانین نے مذہب اور سوسائٹی میں مظلوم عورت کے لئے کوئی آسودگی۔ سہولت۔ آزادی اور رعایت ایسی نہیں رکھی جس سے وہ اپنے تحفظ۔ دادرسی اور مخلصی کی سبیل نکال سکے۔

مرد کی نفس پرستی ہر ہر قدم پر اسے کچلتی اور روندتی نظر آتی ہے۔ اور وہ مجبور و بیکس اس کا آلۂ کار بنی ہوئی خاموش آنسو بہاتی ہے۔ مذہبیت اور

شرافت کی آڑ میں اس پر طرح طرح کے شرمناک مظالم توڑے جاتے ہیں۔ لیکن اس غریب کے لئے دادرسی کی کوئی بارگاہ نہیں۔ سماج کی طرف سے اسے موت کے عمیق غار میں دھکیل دیا جاتا ہے لیکن اس کے لئے مخلصی کا کوئی ذریعہ نہیں۔

مشرقی عورت کی تاریک اور بھیانک زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بلا امتیاز امارت وغربت مجموعی طور پر وہ ایک مرغ قفس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ پہلے تو اس کی تعلیم وتربیت کو ہی جرم سمجھا جاتا ہے اور اگر کسی بہت آزاد خیال خاندان میں اسے جائز بھی قرار دیا جائے۔ تو وہ اس قدر پست، غلامانہ اور غیر معیاری ہوتی ہے۔ کہ اس کے حصول کے بعد مرد کی طاعت گزاری اور غلامی کا تخیّل اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی اس دردناک زندگی پر ہی شاکر وقانع رہنا رضائے خداوندی اور نوشتۂ تقدیر خیال کرتی ہے۔

عورت کی دُنیا اتنی تاریک، اس کی زندگی اس قدر دلدوز آہوں اور نالوں کا مرقع ہے۔ اور وہ اتنی مظلوم ومعصوم ہستی ہے کہ مرد کی دنیا کا ہر طبقہ غریب، امیر، شریف، اوباش۔ رند۔ پارسا۔ بڑا۔ چھوٹا۔ حلیم۔ غصیلہ رحیم۔ ظالم۔ اپنا۔ بیگانہ۔ دشمن۔ دوست اس پر دانستہ اور نادانستہ ارادتاً اور اتفاقاً ظلم وستم، جوروجفا اور قہر وغضب ڈھاتا رہتا ہے۔ اور اس کے

لئے حسن وجمال۔ تجمل و رعنائی۔ شرافت۔ محبت۔ سچائی اور وفاشعاری ایک لعنت بن کر رہ جاتے ہیں۔

ہر مرد عورت کو اپنی جاگیر اور اپنی نفس پرستی کا آلہ سمجھتا ہے۔ اور اسے اپنے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد گھر کی لونڈی باندی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں اور دوسری وحشی قوموں کی اپنی لڑکیوں سے بدسلوکی کا یہ عالم رہا کہ پیدا ہوتے ہی اُن کا گلا گھونٹ دیا جاتا تھا۔ لیکن اس متمدن عہد میں اگر اس کا شروع شروع میں گلا نہیں گھونٹا جاتا تو اس پر ایسے زہر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جو رفتہ رفتہ اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اور وہ موت کی منزل تک پہنچتے پہنچتے بیسیوں دفعہ ماری اور جلائی جاتی ہے۔ گویا تمدن کی برکت سے اس کے لئے وہ آزاد مہیا ہوئے جن سے دورِ جہالت بھی شرمندہ ہے۔

انسانی دُنیا میں عورت پر مرد کی بزرگی اور فوقیت کا مسئلہ بھی ایسا استہزاء آمیز ہے کہ کوئی صاحب شعور اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن حیرت ہے کہ یہ سب کچھ جانتے، سمجھتے اور محسوس کرتے ہوئے بھی کوئی ذی فہم، کوئی شریف اور کوئی حساس فرد اس بدعت کے خلاف آواز نہیں اُٹھاتا۔ ہر شخص اپنی مطلب برآری کے پیش نظر آنکھیں بند کئے اس جادۂ معصیت پر گامزن نظر آتا ہے۔

مرد کی شرمناک زندگی کو بھی عورت کی عفت مآبی پر ترجیح دیجاتی ہے بد طینت سے بد طینت مرد بھی شریف سے شریف عورت سے افضل سمجھا جاتا ہے۔ بدصورت سے بدصورت مرد ایک حور شمائل کو اپنی آغوش میں دیکھنا چاہتا ہے۔ بدکردار سے بدکردار شخص اپنے لئے عصمت و عفت کی دیوی کا انتخاب کرنا چاہتا ہے۔ ظالم سے ظالم آدمی حلیم الطبع۔ بے زبان اور پاکباز عورت کی تلاش میں رہتا ہے۔ خراج سے خراج فرد فاقہ کش اور کفایت شعار بیوی مانگتا ہے۔ غریب سے غریب شخص، امیر۔ رئیس اور دولتمند شریک حیات ڈھونڈھتا ہے۔ رذیل سے رذیل شخص خاندانی عورت کے لئے مصر ہے۔ اور جاہل سے جاہل مرد تعلیم یافتہ منسوبہ کی تلاش میں غرضیکہ مرد کے لئے مرد ہونا ہی اس قدر فخر و ابتہاج کا باعث ہے کہ وہ ہر قسم کے عیوب رکھتے ہوئے بھی محض اس لئے قابل تعزیر نہیں کہ وہ مرد ہے لیکن عورت ہمہ صفت موصوف ہونے پر بھی صرف اس لئے مجرم ہے کہ وہ عورت ہے۔ گویا عورت ہونا بجائے خود ایک ایسا جرم ہے۔ جو کسی طرح قابل عفو نہیں۔

یہ ہیں مرد کے وہ حد سے زیادہ قبیح مظالم جنہیں عورت تو برداشت کئے جا رہی ہے۔ لیکن قدرت کی عدالت زیادہ دیر تک اسے برداشت

نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی "وزیعت" کے استعمال بیجا سے چیں بجبیں ہو کر ٹھوکر لگاتی ہے اور "ثریا مکیں" کو تحت الثریٰ میں ڈال دیتی ہے۔

"عورت کا گناہ" کے عنوان سے میں نے مرد کی تمام تر بدعنوانیوں اور عورت کی زندگی کے سب تاریک پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ وارداتیں اس قدر اہم ہیں کہ ہر ایک پہ ایک ایک ضخیم تصنیف مرتب کی جا سکتی ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ عموماً لمبی چوڑی تحریریں وقت ضائع کرنے کے سوا عوام کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں اور نہ ہی ان کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ان "تلخ حقائق" کو ممکن حد تک اختصار و اجمال سے پیش کیا ہے۔

غالباً یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ ان افسانوں میں مَیں نے انشا پردازی سے زیادہ اصلاح کو مدنظر رکھا ہے۔ بدیں وجہ شاید ان میں ادبی چاشنی اور رنگینی نظر نہ آئے۔ اس لئے اگر اسے "آئینہ عبرت" سمجھ کر دیکھا گیا تو مجھ پہ عین کرم ہو گا۔

بخاری

تقریب

جب کسی قوم - ملک یا فرقہ میں بیداری کی روح پیدا ہوتی ہے - تو اس کے اسباب و علل غیب سے ظہور میں آتے ہیں - اور اس کی ترقی و کامرانی کے ذرائع خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

جس طرح ظلمت کے ساتھ نور اور بدی کے ساتھ نیکی کا گہرا تعلق ہے اسی طرح ہر طبقہ میں جہاں بدکردار پائے جاتے ہیں - وہاں شرفا کی بھی کمی نہیں ہوتی - اور جہاں بے حس افراد کی کثرت ہوتی ہے - وہاں چند ایک ایسے حسّاس نوجوان بھی نظر آتے ہیں - جو حق و انصاف کی اشاعت اور حمایت میں اپنی جنس سے بغاوت کرنے میں بھی تامّل نہیں کرتے۔

مرد نے عورت پر اگر ایک طرف عملی دباؤ ڈالا - تو دوسری طرف اس کو تحریر و تقریر سے ہر طرح نیچا دکھانے اور دُنیا کی نظروں سے گرانے میں سرتوڑ کوشش کی - لیکن لائق تحسین و مبارک باد ہیں وہ ہستیاں جنھوں نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حق و صداقت کی ترجمانی کے لئے قلم

اٹھایا اور اس کٹھن راہ کی تمام تر دشواریوں اور رکاوٹوں کے لئے سینہ سپر ہو کر دوسروں کے لئے مثال قائم کر دی۔

اگرچہ عورت کی عظمت وجلال کے کارناموں کے پیش نظر اب تک جو کچھ اس کے متعلق لکھا جا چکا ہے۔ وہ ایک عشر عشیر بھی نہیں۔ تاہم غنیمت ہے کہ وہ جھجک جو مرد کے بیجا اقتدار نے پیدا کر رکھی تھی۔ روز بروز دور ہوتی جا رہی ہے اور اس طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ رفتہ رفتہ بہت جلد بوالہوس قوت کی چیرہ دستیاں اور مظلوم عورت کی حق تلفی کے واقعات بے نقاب ہو کر رہیں گے

اس موضوع پر اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس میں غالب حصہ ایسا ہے جو بازاری۔ فحش اور بیسوا عورتوں کی حمایت میں لکھا گیا ہے۔ اس مواد میں "لیلےٰ کے خطوط" نہایت پر اثر، ہردلعزیز اور کامیاب تصنیف ثابت ہوئی ہے۔ لیکن جس قدر عریانیت سے اس میں بحث کی گئی ہے۔ وہ تعمیر سے زیادہ تخریب کی حامل ہے۔ اور ایک بیسوا کی زندگی کے شرمناک پہلوؤں کی عقدہ کشائی اور اس کے بے حجابانہ عریاں طرز بیان سے اصلاح کی بجائے ملک وقوم کے نوجوانوں کی ذہنیت مائل بہ معصیت ہونے کا احتمال ہے۔

محترم فارغ بخاری صاحب کے زیر نظر مجموعہ میں جو خصوصیت اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہوں نے عورت کی خانگی زندگی

کے ان تمام دردناک حادثات کو پیش کیا ہے۔ جو مرد کی طرف سے ظلم و تشدّد کی صورت میں معصوم عورت کو وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں۔

مرد کے غیر منصفانہ سلوک و برتاؤ اور اس کے بیجا غرور و بد دماغی کی سختی سے مذمت کی ہے تعلیم نسواں کی حمایت اور اس کے فوائد و برکات بتائے ہیں۔ عورت کی حقوق شناسی اور آزادی پر زور دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ رواداری کی تعلیم!

مجھے اس کتاب کے مسودہ کو مطالعہ کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ مجموعہ ہر لحاظ سے ایک عبرتناک و نصیحت آموز صحیفہ ہے۔

میں نسائی دُنیا کی طرف سے آپ کی اس مستحسن کاوش کا قلبی عقیدت سے خیر مقدم کرتے ہوئے آپ کے احساسات کی قدر کرتی ہوں۔

بلقیس جمال

مقدّمہ

مقدمہ نویسی کی بدعت بھی ایک فرسودہ چیز ہے۔ اور اس کا حاصل سوائے اس کے کچھ نظر نہیں آتا کہ مصنف کے تخیلات و مافی الضمیر تک پہنچنے سے پہلے ناظرین کے پرشوق جذبات کو ایک ناخوشگوار و ناہموار اور غیر دلچسپ گھاٹی کو عبور کرنا پڑے۔ جس کی مسافت میں بیجا کوفت کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔

یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی میں آج ایک ایسے ترقی پسند ممتاز اور نوجوان ادیب کے نفسیاتی شہپاروں پر مقدمہ لکھنے کے لئے قلم اٹھا رہا ہوں جو اس بدعت سے مستغنی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ محض میرے خلوص محبت کو ٹھیس نہ پہنچنے کے لئے وہ اسے گوارا کر رہا ہے۔

میں کوشش کروں گا کہ اجمالی طور پر اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کروں تاکہ قارئین کو زیادہ دیر تک ذہنی انتشار میں مبتلا نہ رہنا پڑے۔

ادب اُردو کی افسانوی دُنیا میں جہاں کامیاب مترجموں کی ایک

بھاری تعداد موجود ہے، وہاں طبعزاد افسانہ نویسوں کی تعداد اس قدر محدود و قلیل ہے جسے انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ افسانہ کے اجزائے ترکیبی میں سے واقعہ نگاری، نفسیاتی نازک بیانی، اور فطری طرزِ نگارش، اپنی لطافت و نزاکت کے باعث اس قدر دشوار چیزیں ہیں جنھیں اپنانے کے لئے نہ ابھی زبان میں اتنی وسعت ہے نہ لکھنے والوں میں اتنی قدرت۔

اس قحط الرجال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مشہور مطابع اور ادبی مارکیٹ پہ ملک کا وہ تاجر طبقہ قابض ہے جسے سوائے جلب زر کے نہ ادبی ذوق سے کوئی لگاؤ ہے نہ معیار ادب سے کچھ تعلق ـــــ اسی لئے لازمی طور پہ ملک میں عامیانہ اور سوقیانہ لٹریچر کی بہتات ہے اور اس کے مقابل مُفید، کار آمد، اصلاحی اور معیاری لٹریچر کم یاب ـــــ اس سے جہاں پست خیال ناشروں کی حوصلہ افزائی سے قوم کی ذہنیت کو پست کیا جا رہا ہے۔ وہاں فطری ذوق سلیم رکھنے والے ثریا پیما ادبا کی حق تلفی سے زبان و ادب کو صدمہ پہنچانے کے علاوہ ملک و قوم کی ترقی کے وسائل محدود کئے جا رہے ہیں۔

میرے عزیز دوست فارغ بخاری کے چند افسانے پہلی دفعہ ۱۹۳۶ء میں جب میری نظر سے گذرے۔ تو انہیں دیکھ کر مجھے خیال ہُوا کہ اگر یہ

ہونہار، حوادث زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ کر مشق جاری رکھ سکا تو ایک دن اس کا شمار ملک کے سر برآوردہ افسانہ نگاروں میں ہوگا۔

فاروخ کی زیر نظر تصنیف "عورت کا گناہ" اس کے طبعزاد افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں اس نے مظلوم عورت کی دکھی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ گناہ جو مرد عورت کے سر تھوپتا ہے۔ درحقیقت وہ خود ہی ان کا محرک ہوتا ہے۔

تاریخ تمدن کی اوراق گردانی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ارتقائے تمدن کا باعث عورت ہے۔ اس کی تفصیل مقصود نہیں کیونکہ یہ چند صفحات اس طوالت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن اجمالی صورت میں اُن کا اظہار ضروری بھی ہے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ عورت نے بعض اوقات نہ صرف اپنے فرائض منصبی ہی ادا کئے بلکہ ان امور کو بھی جو صرف مردوں ہی کے لئے مخصوص تھے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔

زمانہ قدیم میں عورت کو اس کی عظمت کے پیش نظر دیوی کا درجہ دیا گیا۔ اور اس کی پرستش معبود کی طرح کی جاتی رہی۔ جس کا ثبوت آثار قدیمہ اور علم الاصنام نیز بعض مذاہب کے لٹریچر سے بہم پہنچتا ہے ——

لیکن زمانے نے کروٹ بدلی اور عورت کی خدائی کو تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ چنانچہ اب اگر زمانۂ قدیم کی تاریخ دیکھئے تو اس میں کوئی قوم ایسی نہ ملے گی جس نے مظلوم عورت کے حقوق پامال نہ کئے ہوں حتیٰ کہ بعض مذاہب کا دامن بھی عورت کے بےگناہ خون سے رنگین نظر آتا ہے۔

رومۃ الکبریٰ میں راہبوں کے ادنیٰ اشاروں پر گلیوں اور شاہراہوں پر ہزاروں معصوم عورتوں کو ذبح کر ڈالا گیا —— عورت کو ایک ذلیل جنس سمجھ کر طرح طرح کی اذیتیں پہنچانا معمولات زندگی میں شامل تھا۔

۱۸۸۶ء میں پاپائے روم کے حکم سے مذہب کے پردے میں عورتوں کو صرف اس جرم پر سولی دی گئی کہ وہ سحر جانتی ہیں —— انگلستان کی لانگ پارلیمنٹ کے زمانے میں عورتوں کو اس الزام کی بنا پر کہ وہ اپنی جرابیں صابن میں گھول کر ایک قیامت بپا کرتی ہیں مع معصوم بچوں کے موت کی نیند سلا دیا گیا —— خانقاہوں، گرجوں اور تہ خانوں میں عورتوں کی لاشیں بغیر کسی گناہ کے مرد کی بہیمیت کا ماتم کرتی رہیں —— مشرق بھی اس گناہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔

سنین ماضیہ کے واقعات معلوم کر لینے کے بعد اگر موجودہ دور تہذیب پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ مرد کے رویہ میں ابھی تک

کوئی تغیّر واقع نہیں ہوا ——— بلکہ اس کی سخت گیری اور متشدّدانہ پالیسی بدستور قائم ہے۔ ——— مرد اب بھی عورت کو غلام، جنس زائد، اور حقیر شے سمجھتا ہے ؛

عورت کے حق میں مرد نے یہاں تک تعصّب سے کام لیا کہ عورت کے بہت سے ایسے زریں کارناموں کو پردۂ اخفا میں رکھا۔ جس کے منظر عام پر آجانے سے اس کا تفوق ظاہر ہوتا ——— لیکن یہ سب کچھ آخر کب تک برداشت کیا جاسکتا تھا۔ عورت بیدار ہوئی۔ اس نے اس پردۂ ظلمت کو چاک کیا۔ مرد کی ناحق شناسی کو شدّت سے محسوس کیا، اور اس احساس کے ساتھ ہی اس کے رگ و پے میں ایک خوفناک انقلاب کروٹیں لینے لگا۔ مرد نے، ہر چند عورت کے ان ترقی پسند جذبات کو کچلا۔ لیکن اب طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ نسوانی دنیا بیدار ہو چکی تھی، وہ اٹھی اور اس نے اپنے حقوق کا شدّت سے مطالبہ کیا، اور مرد کو جھکنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

مشرق کے غلام آباد خطّے، ہندوستان میں بھی عورت کو ہنوز وہی درجہ حاصل ہے جو گذشتہ زمانہ جہالت میں تھا۔ گو یہاں بظاہر عورت کے خون سے ہاتھوں کو رنگین نہیں کیا جاتا۔ لیکن، وہ روحانی اذیتیں جو عورت کو پہنچائی جاتی ہیں۔ جن ناجائز پابندیوں کی زنجیروں میں

سے جکڑا جاتا ہے۔ اُن سے ہندوستانی عورت کی زندگی سوگوار ہو کر رہ گئی ہے ـــــ یہاں عورت کی گھریلو زندگی اس قدر ستم رسیدہ ہے جس کے مطالعہ سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

فارغ کے لطیف حسیات کو انہیں تلخ و ناخوشگوار نشتروں نے چھیڑا، چنانچہ اس کے افسانوں میں یہی چیز پائی جاتی ہے۔ اس کا ہر افسانہ ایک خاص مقصد و نتیجہ لئے ہوئے ہے، یہاں عنوانات کے تحت ہر افسانے پر کچھ لکھنا مقصود نہیں۔ تاہم چند ایک افسانے ایسے ہیں جنھیں نظر انداز کرنا یقیناً ظلم ہوگا۔ نتائج آموز حقائق اور عبرت آفرینی کے علاوہ ان میں ادبیّت و افسانویت کی روح بھی جھلک رہی ہے۔ جس سے ادبی تشنگی بھی فرو ہو جاتی ہے۔

"ناکردہ گناہ" میں جو اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ بتایا گیا ہے۔ کہ مرد کی معصیّت کاری کے بیان کو عورت کتنے تحمّل سے سنتی ہے ـــــ لیکن برخلاف اس کے عورت کی معمولی لغزش کی بھنک پاتے ہی مرد کے ہاتھ سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ اور وہ از خود رفتہ ہو کر اُسے گھر سے نکال دیتا ہے ـــــ ملاحظہ ہو:۔

"نجمہ ـــــ نجمہ ـــــ تم رو رہی ہو، میری ناپاک ذہنیت پر رو رہی ہو ـــــ نہیں جعفر، میں تمہاری کمزوری کا رونا نہیں روتی،

میں عورت کی بے بسی پر آنسو بہا رہی ہوں"۔

اس نے مجھے اپنے آغوش میں کھینچ لیا اور میرے لبوں پر مہر محبت ثبت کردی —— خدا شاہد ہے، جعفر، یہ بوسہ ہماری محبت کی پہلی اور آخری گستاخی تھی"——

"معیار پرستش" میں سلمیٰ کا یہ غیر فانی فقرہ مرد کی مطلب براری اور خود غرضی کا صحیح مرقع ہے۔

——"عورت کی ہر ادا قابل پرستش ہے جب تک کہ وہ حسین ہے"——

"مظلوم دنیا" میں زرینہ کی انا کے ایک انکشاف سے مرد کی ہنگامی طبیعت اور وقتی جوش کا پتہ چلتا ہے، ملاحظہ ہو:۔

——"اماں سے اس کا تعلق تھا۔ وہ سو روپے ماہوار دیتا تھا اور گھر کا سارا خرچ بھی اسی کے ذمے تھا، تمہاری پیدائش پہ تنخواہ کا یہ سلسلہ تو ٹوٹ گیا۔ البتہ کبھی کبھار آکر کچھ خرچ دے جایا کرتا تھا۔ لیکن حج سے واپسی پر اس نے بُرے اعمال

سے توبہ کر لی ہے اس لئے اب وہ ہمارے گھر آنا بھی گناہ سمجھتا ہے"۔۔۔۔

عورت کی بے چارگی اور بے بسی کی تصویر کھینچتے ہوئے "ترغیب میں ایک جگہ یوں لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔عورت اور پھر ہندوستانی عورت کی درخشاں زندگی بھی مرد کی تاریک تر زندگی سے بد تر ہے۔ وہ ہر جائز حالت میں بھی سوسائٹی کی مجرم قرار دی جاتی ہے۔ جس کے لئے استدلال کوئی معنی نہیں رکھتا"۔۔۔۔

افسانوں کے اختتام پر چند ایک خطوط بھی ہیں۔ جن میں عورت کے ان مصائب کا تذکرہ ہے جو مرد کی بے اعتنائی اور بے وفائی کی وجہ سے اس پر نازل ہو رہے ہیں۔ ایک مقام پر مرد کی ہوس ران طبیعت کا تجزیہ کرتے ہوئے ان فقروں میں نشتر بھر دیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"میں مرد ہوں۔۔۔۔ اور مرد کی فطرت سے بخوبی واقف!
۔۔۔۔ مجھ سے پوچھو اپنی طینت کا حال، آج تم ایک عورت پر قناعت کرنا مشکل سمجھتے ہو، کل جب تمہارے حوصلے بڑھ

جائیں گے، تو تم شائد اعلانیہ طور پر یہ کہو گے کہ مرد کا ہر خواب نشاط ایک حسین دوشیزہ کے ساتھ شرمندۂ تعبیر ہونا چاہیے ——— ورنہ عورت کا مصرف ہی کیا ہے"———

ایک خط کا یہ فلسفیانہ اقتباس خطوط کی جان ہے:-

———"عیاشی اس قہقہے کا نام نہیں جس کے بعد دائمی گریہ ہو عیاشی اس روشنی کو نہیں کہتے جس کے بعد ہمیشہ کے لئے بھیانک تاریکی چھا جائے۔ اور عیاشی اس بہار کو نہیں کہتے جس کے بعد جاودانی خزاں مسلّط ہو جائے ——— حقیقی عیاشی یہ ہے کہ انسان نشۂ شباب سے بہک کر گرنے کے بجائے سنبھل کر چلے اور اپنی تمام عمر آسودہ گزارے"———

فارغ نے اگرچہ اس تصنیف میں عریانی سے اپنے دامن کو بہت بچایا ہے اور حق یہ ہے کہ وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ لیکن تاہم بعض مقامات پر اس کے قلم نے اپنی شوخیاں بتلائی ہیں۔ مثلاً "اوباش" میں منظور کی زبانی اس کی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے کہلوایا ہے:-

——— "نرملا کے غسل خانے میں داخل ہونے کی آواز میں نے سُنی۔ اس کے کپڑے اتارنے اور غسل کرنے کی آواز مجھے آ رہی تھی۔ میں اُٹھا اور مردانے کی بتّی گل کر کے آہستہ سے کُنڈی کھول کر جھانکا وہ غسل کر چکی تھی اور بدن صاف کرنے میں مشغول تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے بالکل قریب جا پہنچا وہ کپڑے پہننا چاہتی تھی کہ میں نے دھیمی آواز سے کہا "نرملا" اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور سکتہ کر رہ گئی"۔

اسی طرح اور دو ایک مقامات پر بھی فارغ کی طبع جواں نے شوخی سے کام لیا ہے جسے اس کے جوشِ جوانی اور تقاضائے سنِ شباب پر محمول کرنا چاہیئے۔ میں ذاتی طور پر ایسی عریاں نگاری کا قائل نہیں ہوں۔ جس سے انسان کا ذوقِ سلیم مجروح ہو۔ اس واسطے بھی فارغ کے اس قبیل کے فقرات میرے نزدیک محلِ نظر ہیں۔ ورنہ موجودہ دور کے ترقی پسند ادیب ایسی عریانی کو افسانوں کی کامرانی خیال کرتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار صاحب اور ایم اسلم صاحب کی تصنیفات میں ایسی طرزِ نگارش اکثر ملتی ہے۔ جو ملک کے نوجوان اور رومان پسند طبقے کے لئے دلچسپی کا باعث ہے ــــ یہ صحیح ہے کہ "گناہ کی راتیں" ــــ اور "لیلیٰ کے خطوط" اصلاحی جذبے کے ماتحت لکھے گئے ہیں۔ لیکن اصلاح کے مقابلے میں ان کی عریاں نگاری کا پلہ بھاری ہے۔
بہر کیف فارغ، قابلِ ستائش ہے کہ اس نے حتی الوسع سنجیدگی کے دامن کو نہیں چھوڑا۔

جہاں تک ہندوستانی عورت کی سوگوار زندگی کا تعلق ہے، فارغ نے اس کے مختلف پہلوؤں پر مختلف رنگ میں بحث کی ہے ــــ اس کے مصائب کو بے نقاب کیا ہے ــــ اس کے ان زخموں کے لئے مرہم اندمال طلب کیا ہے جو مرد کی بوالہوسی، خود پرستی؛ اور بے جا تفوق کے باعث اس کے لطیف جسم میں پڑ چکے ہیں۔ میرے خیال میں فارغ ان تمام واقعات کے بیان کرنے میں کامیاب رہا ہے ــــ اور ایک افسانہ نگار کا اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قادر ہونا ہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

فارغ کے ان افسانوں میں، رنگینی، شاعری، ادبی چاشنی اور دماغی نقش سے زیادہ اصلاحی رنگ غالب ہے، جو اس تصنیف کا طرہ

امتیاز اور حساس مصنف کا عین منشا ہے —— کاش ہندوستان کا خود پرست، صنفِ نازک کو اپنی ملکیت اور ہر جائز و ناجائز خواہش کا آلۂ کار سمجھنے والا طبقۂ ذکور اس کو —— بوالہوسانہ جذبات اور عصبیت سے یکسر خالی الذہن ہو کر —— مطالعہ کرے۔

پشاور
ستمبر ۱۹۴۰ء

رضا ہمدانی
سیکرٹری 'ادبستان'

ناکردہ گناہ

نجمہ! ہماری زندگی کتنی خوشگوار ہے۔ میں ہمیشہ شادی کرنے کو لغو سمجھتا تھا۔ اور اسی لئے اب تک گریز کرتا رہا۔ میرا مقولہ تھا۔ کہ دولتمند آدمی کو شادی کی ضرورت ہی نہیں۔ جبکہ یوں بھی اسے سب طرح کی آسائشیں بڑھ چڑھ کر حاصل ہو سکتی ہیں۔ اور میں ایسا ہی کرتا بھی رہا، مجھے شادی سے قبل بھی یہ سب سہولتیں میسّر تھیں۔ میرے ایک ادنےٰ اشارے پر میری ضروریات کے سب سامان مہیّا ہو جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود میرے لئے صرف ایک چیز کا فقدان رہا۔ اور وہ اطمینان قلب تھا۔ یہ چیز مجھے اس سے پہلے کبھی میسّر نہ ہو سکی۔ میں ہر وقت اس کے لئے مضطرب رہتا تھا۔ میری یہ خلش کبھی دور نہ ہوئی اور آخر مجھے اعتراف کرنا پڑا۔ کہ یہ نعمت عظمےٰ سیم و زر سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

نجمہ! میری یہ حسرت صرف تم نے پوری کی۔ تم سے وابستگی کے

بعد میری یہ آرزو بر آئی۔ تمہاری وفا شعاری اور محبّت بھرے دل نے مجھے ایک خطرناک روگ سے نجات دلائی۔ اب اگرچہ میرا دولتمندی کا گھمنڈ جاتا رہا۔ میرا سرمایہ داری کا نشہ ہرن ہوگیا۔ تاہم میری زندگی اب اتنی پر سکون ہوگئی ہے۔ مجھے تسکین قلب کی وہ دولت مل چکی ہے جس نے مجھے اس نام نہاد ثروت سے بے نیاز کر دیا ہے۔

نجمہ تم بے شک حسن کی دیوی ہو۔ محبّت کی پتلی ہو۔ لیکن میں صرف اسی چیز سے مرعوب نہیں ہوا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم سے پہلے مجھے یہ چیزیں بھی بہم تھیں۔ آہ! وہ سکینہ حسن وجمال کی ملکہ سکینہ۔ مجھے پروانہ وار چاہتی تھی۔ مجھ پہ جان چھڑکتی تھی لیکن میں نے اُسے ــــ اس پریم مورتی سے سخت دغا کی۔ اُسے اپنی ہوسرانیوں کا شکار بنائے رکھا۔ اور آخر ــــ میں نے وہ کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیے تھا ــــ نہیں۔ نہیں میں یہ کہنا چاہتا تھا۔ کہ پھر نہ جانے تم میں وہ کون سی خوبی ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایسا کیسا سحر بھرا ہے۔ جس نے میرے دل کو مسخر کر لیا ہے میں آج ــــ"

نجمہ (بات کاٹتے ہوئے) "نہیں۔ نہیں۔ تم وہ سکینہ والا قصّہ سناؤ نا ــــ کہتے کہتے رُک کیوں گئے ــــ میں سُنے بغیر ہرگز نہ رہوں گی۔ تمہیں میرے سر کی قسم۔ کہو نا۔ سکینہ سے تم نے

کیا دغا کی۔ تم تو کہتے ہو کہ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ پھر یہ کیا؟"

"نہیں پیاری ــــــ وہ کوئی خاص بات نہیں۔ بس یہی کہ وہ مجھے چاہتی تھی۔ اور میں نے اس سے بیوفائی کی"۔

"ہاں۔ہاں مجملاً تو یہ واقعہ اتنا ہی ہے اور یہ تو تم کہہ بھی چکے ہو لیکن میں تو اس کی تفصیل سُننا چاہتی ہوں۔ دیکھو جعفر! ہماری جدید زندگی میں یہ پہلا حادثہ ہے، جو مجھے تمہاری طرف سے بددل کر رہا ہے میں تمھیں کیا سمجھ رہی تھی اور تم مجھے کیا یقین دلا رہے تھے اب یہ سب پلاٹ مجھے ایک دھوکا اور فریب معلوم دے رہا ہے۔ میں تمھیں یہ جتا دینا چاہتی ہوں کہ میری بدظنی سے ہرگز خائف نہ ہو۔ میں اتنی تنگدل اور تنگ نظر نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ کسی ایک دل سے وابستگی سے پہلے انسان عشق و محبت کے ایسے ایسے کئی حادثات سے دوچار ہو جاتا ہے۔ عالم شباب کے ایّام کو زمانۂ جہالت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اور نشۂ جوانی میں بہکی ہوئی حالت کے جرم کو قابل تعزیر نہیں ٹھہرانا چاہیے البتہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد اگر ایسی حماقت کا ارتکاب کیا جائے۔ تو یہ ایک ایسا سنگین جرم ہوتا ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہارے اس واقعہ سے چاہے وہ کس قدر ہی آلودۂ عصیاں اور بھیانک کیوں نہ ہو۔ کسی قسم کا اثر نہ لونگی تم بے خطر ہو کر بے کم و کاست سب قصہ کہہ سُناؤ ــــــ ورنہ بصورت دیگر اس کا اثر عمر بھر کے لئے ہمارے مابین ایک ایسا رخنہ حائل کر دے گا۔ جس کا دور ہونا ناممکنات سے ہوگا ــــــ کہو ــــ جعفر جلد کہو ــــ مجھے بھی اپنے دور جہالت کا ایک واقعہ یاد آگیا ہے۔ تم یہ داستان سنالو تو میں من و عن ساری روداد بیان کروں گی"۔

جعفر! ــــ (گہری سوچ سے چونک کر) "تم پہلے بیان کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرور سناؤں گا"۔

نجمہ (مضطرب ہو کر) "عجب ہٹ دھری ہے"۔ اچھا نہ سناؤ جانے دو۔ بس دیکھ لیا۔ کہہ تو چکی ہوں کہ تم سنالو تو میں بھی کہہ سناؤں گی۔ میں تمہاری طرح تھوڑی ہوں جو خواہ مخواہ چھپاتی پھروں اور اگر ایسا ہوتا تو میں خود ہی تم سے وعدہ کیوں کرتی"۔

جان من! ناراض کیوں ہوتی ہو۔ لو سُن لو ــــ مجھے بیان کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ میں تو یونہی تمہیں ستا رہا تھا۔ ورنہ یہ واقعہ تو کیا میری روح کی گہرائیوں کا راز بھی تمہارے لئے حاضر ہے۔

لیکن ہاں پہلے ایک دفعہ پھر وعدہ کر لو۔ کہ اپنا قصہ بھی ضرور سناؤں گی۔"

"ہاں —— ہاں —— ضرور۔ بالضرور سناؤں گی۔ تمہیں تو کسی نگوڑی کے کہنے پر یاد رہی نہیں آتا۔ نہ جانے کتنے بے اعتماد ہو۔"

اجی وہ واقعہ یوں ہے کہ —— دیکھو نجمہ یہ داستان بہت حد تک عریاں اور میری بد اعمالیوں کی آئینہ دار ہے۔ اور اسی لئے میں بیان کرتے ہوئے جھجکتا ہوں —— خدا کے لئے بدگمان نہ ہونا —— بقول تمہارے وہ تو جہالت کا زمانہ تھا۔ اب تو میری زندگی کا سہارا تم اور صرف تم ہو ——"

"بس رہنے بھی دو ان باتوں کو —— اطمینان رکھو میں اتنی بیوقوف نہیں ہوں۔"

"نجمہ! یہ کالج کے زمانے کا واقعہ ہے۔ میں سیکنڈ ایر میں پڑھتا تھا۔ سکینہ میری کلاس فیلو تھی وہ کانپور کے رہنے والے تھے۔ اس کے والد کی تبدیلی دہلی ہو گئی تھی۔ آخر سال میں اکتوبر میں اس نے کالج جائن کیا سارا کالج اس کا مداح اور اس کے حسن و جمال پر فریفتہ تھا حتیٰ کہ پروفیسر بھی اسے دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتے تھے۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد

آگیا ہے۔

مسٹر یعسوب الحسن ہمارا پرشین پروفیسر تھا۔ ایک دن وہ کلاس میں لیکچر دے رہا تھا۔ اس کی نظریں سکینہ پر جمی ہوئی تھیں۔ سکینہ کی مدہوش کن شرابی آنکھوں ۔۔۔ اسے یہاں تک بیخود کر دیا کہ اسے اپنی حیثیت اور اپنے موضوع کا قطعی خیال نہ رہا۔ اس کی وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بوکھلائے ہوئے لیکچر دیتے دیتے پکار اٹھا ——— سکینہ ——— سکینہ ——— تم مجھے کیوں گھور رہی ہو۔ تمہاری آنکھوں کے ان گلابی ڈوردں سے یہ شراب سی کیوں جھلک رہی ہے ——— تم سکینہ ——— نہیں نہیں آئی مین (I mean) سکینہ (اس نے کھانستے ہوئے سنبھل کر کہا) تم نیچے دیکھو ———"

ساری کلاس پروفیسر کی اس مخبوط الحواسی پر قہقہے لگا رہی تھی اور وہ بیچارہ تھا کہ شرم سے عرق عرق ہوا جاتا تھا۔ کلاس کو بہت ڈانٹ ڈپٹ دکھائی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ کمرہ میں بدستور قہقہے گونج رہے تھے۔ بالآخر وہ غریب باہر نکل گیا ——— غرض مقصد یہ کہ سکینہ بےمثال شکل و صورت کی مالکہ تھی۔ کالج بھر کی آنکھیں اس پر لگی ہوئی تھیں ہر ایک قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ لڑکے تو لڑکے ٹھہرے ——— کالج کی لڑکیاں بھی اس پر بےطرح فریفتہ تھیں ہر ایک اس سے بہناپا

گانٹھنے کو بے قرار تھی۔ لیکن وہ ——— غرور و نخوت کی پتلی کسی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی دوسرے لڑکوں کی طرح مجھے بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اس سے راہ و رسم پیدا کروں۔ لیکن میری حالت دوسروں سے کچھ مختلف تھی اور وہ یوں کہ میں اس مغرور کی بد دماغی سے جل رہا تھا۔ میں اسے مغلوب کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لئے میں اپنی تمام کوششیں ختم کر چکا تھا۔ دولت جس پر مجھے بہت ناز تھا۔ میں پانی کی طرح بہا رہا تھا لیکن مجھے اس معاملہ میں کچھ کامیابی نہ ہو سکی۔

ہمارا ٹیسٹ ایگزامینیشن (TEST EXA·MiNATiON) تھا خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اسے میرے برابر والی سیٹ ملی ہوئی تھی۔ ہمارا حساب کا پرچہ تھا۔ پرچہ مل چکا تھا۔ اور ہم اسے حل کرنے میں منہمک تھے کہ اچانک اس نے آہستہ سے کہا:"آپ میری کچھ مدد کریں گے"۔

میں نے چونک کر دیکھا اور کہا ——— فکر نہ کیجئے۔ یہ اس کی اور میری پہلی گفتگو تھی۔ میں دل میں پھولا نہ سماتا تھا۔ میں نے آنکھیں بچا کر اُسے تین سوالوں کے حل پہونچا دئے اس طرح ہماری دوستی کا آغاز ہوا اور آخر یہاں تک راہ و رسم بڑھ گئی کہ ہم ایک دوسرے سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوتے تھے۔

اب ہم دونوں کالج چھوڑ چکے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ والے مکان

میں رہتے تھے۔ اُسے مجھ سے عشق ہو گیا تھا۔ یہ اس کی سادگی تھی یا میرا فریب! کہ اسے میری محبت کا یقین ہو چکا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سے وعدے لے رکھے تھے۔ لیکن دراصل میں اسے صرف اپنی ہوس پرستی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ مجھے اس سے قطعاً دلی محبت نہ تھی اور نہ جانے اس کا باعث کیا تھا۔

دو سال کے طویل انتظار کے بعد آخر میرا فریب چل گیا —— جولائی کے تپتے مہینے میں سکینہ کے والد سے اجازت لے کر ہم شملہ گئے۔ وہاں ہم اکیلے تھے۔ ساتھ صرف دو ملازم اور ایک ملازمہ تھی۔ وہ شملہ میں پہلی رات تھی۔ ہم اپنے بنگلہ کے ایک مزیّن کمرہ میں ۔ بدو تھے۔ وہ پلنگ پر شبانہ لباس پہنے جو ایک بوسکی کی سفید قمیص اور پاجامے پر مشتمل تھا۔ دراز تھی اور میں اس کے پاس بیٹھا اس کے نازک یاقوتی لبوں سے کھیل رہا تھا۔ محبّت والفت کے لمبے چوڑے مواعید کا اعادہ کیا جا رہا تھا۔ میں اس وقت شیطنت کا مجسمہ بنا ہُوا تھا۔ عصیاں کے بادل میرے سر پر منڈلا رہے تھے۔ میرے ہاتھ گستاخانہ طور پر اس کی طرف بڑھ رہے تھے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ عالم وارفتگی میں ایک بدمست شرابی کی طرح جھوم رہا تھا۔ اور اس کی ہر بات پر لبیک کہہ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کے گلابی رخساروں کو بوسہ دیا۔ نجمہ نجمہ —— ہاں —— ہاں کہے جاؤ —— میں سُن رہی ہوں

—— تم رُکتے کیوں ہو —— گھبراؤ نہیں —— کہے جاؤ ——"

"نہیں —— نہیں —— بس اب تم خود ہی سمجھ جاؤ —— آگے میں بیان نہیں کر سکوں گا —— وہ حیا سوز واردات الفاظ میں ادا کرنی محال ہے"۔

"نہیں —— تمہیں کہنا پڑے گا —— نہیں تو پھر میں ——"

اچھا سُنو —— اس کے بعد وہ میری آغوش میں تھی اس نے مجھے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن وہ میرے بے قابو جذبات سے رہائی نہ پا سکی۔ میں نے جھوٹی قسموں اور وعدوں سے ہر طرح اسے مطمئن کر دیا۔ اور آخر وہ ہُوا جس کے بیان سے انسانیت اور شرافت لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے۔

ہم شملہ میں ایک مہینہ رہے اور اس عرصہ میں وہ میری عشرتوں کا گہوارہ بنی رہی۔ میں نے جی کھول کر اپنے سارے حوصلے نکالے اور اُس کے حُسن و شباب کی خوب سیر ہو کر خوشہ چینی کی۔

اگست کے شروع میں ہم دہلی آ پہنچے تھے۔ اب میرا جذبۂ محبت سرد ہو چکا تھا۔ اب میں اس سے کتراتا پھرتا تھا۔ دِنوں بلکہ ہفتوں اسے مُنہ نہ دکھاتا۔ وہ بیچاری میرے لئے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی رہتی تھی۔ آہ۔ اس کے وہ خطوط جو اس کے دردِ دل سے لبریز ہوتے

تھے۔ دن میں مجھے کئی کئی موصول ہوتے رہتے۔ وہ سارے کنبہ میں رسوا و بدنام ہو چکی تھی اس کا روپیہ میرے نام پہ پانی کی طرح میرے ملازموں اور دوستوں کی بھینٹ چڑھ رہا تھا۔ اور میں ——— میں خوش تھا کہ اپنی حکمت عملی سے مطلب بر آری میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اس کے دکھ اور مصیبت کا احساس تک نہ تھا۔ عرصہ گذر گیا۔ وہ بیمار ہو گئی مجھے اطلاع ملی۔ لیکن میں نے پرواہ تک نہ کی۔

ایک دن میں اپنی عشرت گاہ میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس کا والد آ گیا ——— وہ مجھے خلوت میں لے گیا۔ آہ ——— کیا بتاؤں نجمہ! کہ وہ کتنا صبر آزما منظر تھا۔ اس نے روتے ہوئے سکینہ کے حاملہ ہو جانے کا ذکر کیا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس نے اپنا عمامہ اتار کر میرے پاؤں پہ رکھ دیا۔ اور گڑگڑا کہ کہنے لگا۔ خدا کے لئے "اس وقت ہماری لاج رکھ لو۔ تم نے اس کی عصمت پہ ڈاکہ ڈالا۔ اب خود ہی اسے سنبھال لو" اس وقت اس کی حالت دیکھ کہ پتھر سے پتھر دل بھی پسیج جاتا۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ لیکن افسوس میں کچھ نہیں کر سکتا تھا میں نے اُسے بہزار دقت ٹالا۔

آہ! نجمہ اور کیا سناؤں۔ اس کے چند دن بعد ہی سُنا کہ سکینہ نے زہر کھا کہ خودکشی کر لی۔

وہ معصوم ـــــ محبت کی دیوی اپنی رنگین جوانی کو میری ہوس رانیوں کی بھینٹ چڑھا گئی۔ اس کے بعد اس کے والدین بھی یکے بعد دیگرے اپنی اکلوتی بیٹی کے غم میں گھل گھل کر دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ تین خون جو میرے وحشیانہ اور بہیمانہ افعال کی وجہ سے میرے سر ہیں۔ قدرت مجھے کبھی مُعاف نہیں کرے گی۔ اُف! اس واقعہ کی یاد سے دُنیا میرے لئے جہنم بن جاتی ہے۔ سکینہ ـــــ وفادار سکینہ معصُوم سکینہ کی یاد سے اب میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ لیکن عبث ہے عبث ـــــ اب اگر میں اس کے لئے تمام عمر بھی پشیمانی کے آنسُو بہاتا رہوں تو بھی اس کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا۔

آہ ـــــ میرا دل پھٹنے لگا ہے۔ نجمہ۔ مجھے بچاؤ۔ خدا کے لئے مجھُے سہارا دو ـــــ وہ سامنے سکینہ کھڑی مجھے گھور رہی ہے ـــــ

نجمہ ـــــ نجمہ۔ تم رو رہی ہو۔ میری ناپاک ذہنیت پہ رو رہی ہو؟

ـــــ نہیں جعفر ـــــ میں تمہاری کجروی کا رونا نہیں رو تی۔ میں عورت کی بے بسی پہ آنسو بہا رہی ہوں۔ آہ! اس دُنیا میں عورت کتنی مجبور ہستی بنائی گئی ہے ـــــ مذہب۔ سوسائٹی اور سماج سب کی طرف سے اس غریب پہ ایسی ایسی ناجائز پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ جن سے اس کا جینا دو بھر ہو گیا ہے۔

جعفر ——— "نجمہ تمہیں قسم ہے سچ بتانا۔ تم نے اس واقعہ سے کچھ بُرا اثر تو نہیں لیا۔ اگرچہ یہ واقعہ میری خباثت کا آئینہ دار ہے اور لازم ہے کہ اُسے سُن کر مجھ سے نفرت کی جائے۔ انتہائی نفرت ——— لیکن تم تو ———"

نجمہ (بات کاٹتے ہُوئے) "تم بار بار اسے کیوں دہراتے ہو۔ چلو چھوڑو ——— موضوع بدلو ——— کچھ اور باتیں کریں"۔

جعفر! ابھی تو تم نے اپنی داستان سُنانی ہے اتنی جلدی بھول گئیں کیا ——— سناؤ۔ جلد سناؤ۔ میں منتظر ہوں۔

نجمہ! وہ کل سہی نا ——— اب دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ جعفر! نہیں۔ نہیں۔ جلد سُناؤ۔ میں ابھی اور اسی وقت سنونگا۔

نجمہ! سچ کہوں ——— یونہی تم سے دل لگی کر رہی تھی۔ تمہیں کہو کہ اگر یوں نہ کہتی تو تم یہ قِصّہ کب سُنانے والے تھے۔

تو کیا تم نے مجھے فریب دیا۔ نجمہ ——— تم سے یہ توقع نہ تھی۔

جعفر! نجمہ کبھی تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتی۔ تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں وہ راز ظاہر کر دوں لیکن میں ڈرتی ہوں کہ تم مرد ہو۔ اگرچہ میرے اس قِصّہ کو تمہارے واقعہ جتنی اہمیت حاصل نہیں۔ پھر بھی مجھے خوف ہے کہ شاید تم اسے سننے کے متحمل نہ ہو سکو۔ تم مرد ہو۔ عورت

رشک و حسد میں مرد سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اس کا دامن صبر و ضبط بہت وسیع ہوتا ہے اور یہ چیز مرد میں عنقا ہے۔ وہ جذبات کی ہنگامی رو میں بہہ جاتا ہے۔ مرد اور عورت کی حیثیت ایک حاکم و محکوم کی سی ہے۔ حاکم کا ہر فعل چاہے وہ کتنا ہی ناجائز اور خلاف قانون کیوں نہ ہو۔ جائز سمجھا جاتا ہے۔ اور محکوم کی ہر حرکت جو نا قابل تعزیر ہی کیوں نہ ہو۔ ذرا حاکم کی طبیعت کے خلاف ہوئی اور وہ مجرم اور "باغی" کہلایا۔

بجمہ یہ تنقید پھر بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت میں وہ واقعہ سننے کو بے قرار ہوں۔ خدارا جلد بیان کرو۔ کیا تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں۔ مرد چاہے کتنے ہی برُے کیوں نہ ہوں۔ لیکن جعفر کو ان کا مقلد ٹھہرانا تمہاری بدیہی غلطی ہے۔

اچھا کہتی ہوں ذرا مجھے سوچ لینے دو ــــــ وہ ہمارا رشتہ دار تھا ــــــ رشتہ دار ــــــ بالکل قریبی ــــــ جعفر میں اُس کا نام نہیں بتاؤں گی ــــــ ہائے اللہ ــــــ میں کیسے بیان کروں۔ زبان ہی نہیں چلتی۔ الفاظ ہی ادا نہیں ہوتے۔ عجب الجھن میں پڑی ہوں۔

ہاں۔ وہ ہمارا بہت ہی قریبی رشتہ دار تھا۔ دراصل ہم ایک

ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ ہمیں فطرتاً ایک دوسرے سے بے حد انس پیدا ہو گیا تھا۔ ہم بہت عرصہ تک پریم و الفت کی الجھنوں سے بے نیاز رہے۔

ہائے وہ کیا زمانہ تھا۔ کاش! وہ عہد ہمیشہ قائم رہتا اس وقت بھی ہم اس قدر مانوس تھے کہ ایک دوسرے کے بغیر کھیل کود بے مزہ معلوم دیتی تھی۔ ذرا ہوش سنبھالا۔ تو یہ کڑیاں اور زیادہ مضبوط ہو گئیں ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ باہم عہد و پیمان ہوئے۔ ہر وقت عشق و محبت کے تذکرے رہتے ایک دوسرے کی تعریفوں کے پل باندھتے اور وفاشعاری کے عہد لیتے۔ لیکن ہماری محبت صرف پرستش اور راز و نیاز تک محدود تھی۔ ہماری محبت کتنی معصوم تھی۔ اور ہم ایک دوسرے کو کس قدر چاہتے تھے۔ یہ ہمارے دل ہی جانتے ہیں۔ جن میں ابتک ایک دوسرے کی یاد اسی طرح باقی ہے۔ کاش! یہ ظالم سماج والے ہمیں اپنے پریم بندھن نباہ لینے دیتے۔ یہ کہتے کہتے نجمہ کا دل بھر آیا اور وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

سماج بڑا ظالم ہے۔ اس ظالم نے ہماری درخشاں امیدوں کو بر آنے نہ دیا اور ہماری حسرتوں کو کچل دیا۔

وہ ایک منحوس شام تھی۔ ہماری قسمت کی طرح بھیانک اور تاریک ہم اپنے کمرہ میں بیٹھے راز و نیاز کے سفینے کھے رہے تھے ہم اس قدر محو تھے کہ ہمیں قطعاً کچھ احساس تک نہ رہا۔ ہم محبّت کے بے پناہ سیل میں بہے جا رہے تھے۔ ہم نے انتہائی خلوص کے ساتھ عمر بھر کے لئے جدا نہ ہونے کی سوگند کھائی۔ میری آنکھوں میں محبّت کے آنسو بھر آئے اور میں فرط الفت سے اس کے قدموں میں جھک گئی۔ اصغر نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر آغوش میں —— بس جعفر اور نہ سنو۔ میں بیان نہ کر سکوں گی۔

اصغر! کون اصغر یہی تمہارا ماموں زاد بھائی جو گاہے گاہے یہاں آتا رہتا ہے۔

نہیں نہیں۔ جعفر یہ نہیں۔ اس کا نام اصغر نہ تھا یونہی زبان سے اصغر نکل گیا۔

اب چھپاتی کیوں ہو۔ میں جان چکا ہوں۔ اچھا تم بیان کرو۔ پھر کیا ہوا۔

"کچھ نہیں۔ ہونا کیا تھا"

"کہو بھی —— پھر وہی بات"۔

"جعفر سچ کہو —— تم اثر پذیر تو نہیں ہو رہے"۔

"نہیں ۔ نہیں ۔ قطعاً نہیں ۔ تم کہتی جاؤ"۔

ہاں تو اس نے مجھے آغوش میں کھینچ لیا اور میرے لبوں پر مہر محبت ثبت کی ۔ خدا شاہد ہے ۔ جعفر یہ بوسہ ہماری محبت کی پہلی اور آخری گستاخی تھی ۔

آہ! ابا جان دروازے کی آڑ کھڑے جھانک رہے تھے ۔ انہوں نے ہماری سب باتیں سُنیں اور ساری حماقتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں ۔ ایک دم گرجتے ہوئے سر پر آ نازل ہوئے ۔ ہم دونوں خوب پٹے اور آخر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیے گئے وہ وہ پابندیاں عاید کی گئیں کہ ایک دوسرے کو ملنا تو کجا دیکھنا بھی محال ہو گیا ۔

پھر کیا ہُوا ؟ بس یہی کہ تم سے میری زبردستی شادی کر دی گئی ہماری محبت میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا ۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو اسی طرح چاہتے ہیں ۔ البتہ اب صورت کچھ بدل چکی ہے ۔ اب ہماری محبت ایک بھائی بہن کی محبت ہے ۔ میں اسے اب بھی ایک بھائی کی طرح پُوجتی ہوں ۔ اور زندگی بھر اس کی یاد میرے دل میں باقی رہے گی ۔ ہماری محبت لابدی اور غیر فانی ہے ۔ ہم —— جعفر! تم کس سوچ میں پڑ گئے ۔ کیا نیند کا غلبہ ہو رہا

ہے۔

"میں سوچ رہا ہوں۔ کہ تم نے ابھی تک اس کا نام مجھ سے کیوں چھپائے رکھا۔"

"نام بتانے میں کیا ہے۔ لو۔ نام بھی بتائے دیتی ہوں — تم ٹھیک سمجھے تھے۔ وہی اصغر ہے۔ میرا ماموں زاد بھائی۔"

میں نہ کہتا تھا کہ وہی ہوگا۔ اس کا ہر ہفتے بن سنور کر یہاں آنا مجھے پہلے ہی مشکوک گذرتا تھا۔ آخر میرا خیال صحیح نکلا نا۔ تم نے اب تک مجھے سخت دھوکے میں رکھا۔ مجھے تمہاری اس بُری طینت کا علم نہ تھا۔ میں تو تمہیں معصوم سمجھ رہا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم عورت کی شکل میں ڈائن ہو۔ ڈائن۔"

"جعفر — جعفر — یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ حواس درست کرو۔"

"حواس درست کروں۔ ذلیل عورت۔ تیری ناپاک ہستی تو بازاری عورتوں سے بھی بدتر ہے۔ دور ہو جا۔ میرے سامنے سے۔ میں تیری منحوس شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

(نجمہ جعفر کے پاؤں پر گر کر روتے ہوئے) "مجھے معاف کر دو جعفر! خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ہماری

محبت پاک اور معصوم ہے۔

(جعفر ٹھوکر مارتے ہوئے) "چلی جا ـــــ دور ہو جا ـــــ تو نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تمہاری محبت ـــــ پاک تھی۔ چہ خوب۔ بس بس میں زیادہ بکواس سننا نہیں چاہتا۔ اپنے نجس وجود سے میرے گھر کو ابھی اور اسی وقت خالی کر دے"۔

(نجمہ ہاتھ جوڑتے ہوئے) "جعفر! رحم کر۔ رحم"۔

جعفر نے بے رحمی سے دھکا دیا۔ نجمہ فرش پر گر کر بیہوش ہو گئی۔

اس واقعہ سے نجمہ کا توازن دماغی بگڑ گیا وہ پاگل ہو گئی ـــــ بازاروں میں خاک اڑاتی پھرتی تھی۔ اور یہ فقرہ اس کے ورد زبان تھا۔

"مجھے معاف کر دو جعفر! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا"۔

معیارِ پرستش

نشہ میں بھیگی ہوئی رات کی ستم ظریفیوں پر تارے تبسم لٹا رہے تھے اور چاند شب کی گردشوں میں گم صبح کا منتظر تھا۔ شمشاد سُرعت کے ساتھ راستہ کاٹے جا رہا تھا۔

"تم آ گئے شمشاد۔ چند قدموں کے فاصلہ سے رات کے مرگ آفرین سکوت میں ایک نغمہ بدوش آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"ہاں سلمٰے!" اس نے گھبرا کر کہا۔ آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ پائے۔

"تو کیا تم بالکل تیار ہو" شمشاد نے پوچھا۔

سلمٰے! "ہاں بالکل"۔

شمشاد! "چلو تاروں کی چھاؤں میں گاؤں سے نکل چلیں۔

دوسرے روز کملا گھاٹ پر سکھیاں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ کہ سلمٰے رات کی تاریکیوں میں غائب ہو گئی اور سلمٰے شمشاد کے ساتھ عہد نگہ

کے پُر فضا شہر میں آئندہ زندگی کا حل تلاش کر رہی تھی۔

شمشاد! تم جانتے ہو۔ میں عورت ہوں۔ ہندوستانی عورت بے بس مخلوق اور وفا و محبت کی غارتگریوں میں حیات ابدی کی متلاشی، دیکھو اگر تم پریم کھیلا ہار جیت کے لئے کھیلنا چاہو تو میں ہاری ......"

"سلمٰے" شمشاد نے نہایت پُر اطمینان لہجہ میں کہا "خدا کے لئے بدگمان نہ ہو۔ میرے نزدیک عورت کی ہر ادا قابل پرستش ہے۔ اور تم سلمٰے! عورت ہی نہیں۔ دیوی ہو دیوی!!"

مہندر نگر میں وہ دونوں ایک سال نہ گزار چکے تھے۔ کہ اچانک سلمٰے پر فالج گرا۔ مُنہ ایک طرف کو پھر گیا۔ اس پر غضب یہ ہُوا۔ کہ جب قدرے تندرست ہُوئی۔ تو باورچی خانہ میں بھڑکتی ہُوئی آگ نے اس کے چہرے کو اس قدر جھلسا دیا کہ حُسن و شباب عشق کی آرزو نے نشاط سے شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

آہ! شمشاد اس انقلاب کی کب تاب لا سکتا تھا۔ وہ مرد تھا اور فطرتاً پرستار حسن نہ کہ دلدادۂ وفا۔ ایک دن وہ بازار سے واپس لوٹا تو سلمٰے سے کہنے لگا "والد کا تار آیا ہے کہ وہ سخت بیمار ہے۔ چند روز کے لئے جانا ہوگا۔ تم بھی چلو"۔

"تم جاؤ شمشاد! خدا تمہارے والد کو صحت دے۔ میں تمہاری منتظر رہوں گی"۔ (سلمےٰ نے اپنی بے چینیوں کو چھپاتے ہوئے جواب دیا)

دوسرے روز شمشاد اپنے وطن جہانگیر آباد چلا گیا۔

شمشاد کو گئے ہوئے کامل بیس برس گزر چکے تھے۔ مجبور وفا سلمےٰ اپنے سلیم کے سہارے جی رہی تھی۔ اس کے پاس اپنی متاع رفتہ کا نشان اور شمشاد کی تنہا یادگار ایک سلیم ہی تھا۔ جسے اُس نے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور جو رئیس شہر کے کرم سے یورپ چلا گیا۔

اگرچہ سلمےٰ کی جوانی غم عشق اور ستمہائے روزگار نے غارت کردی تھی۔ اس کے سفید بال محبت کی تاریکیوں کو چھپانے کی کوشش کررہے تھے۔ لیکن آہ! وہ کس قدر مسرور ہوتی۔ جب اس کا لال مہندر نگر میں یورپ سے آئی سی ایس ہوکر آیا۔ ایک روز سلمےٰ نے سلیم سے کہا۔

"میرے بچے! میرے فرائض ادا ہو چکے۔ اب تم برسر روزگار ہو۔ مجھے اجازت دو کہ ایک بار جہانگیر آباد ہو آؤں۔

سلیم:"امی جان! دسمبر کی تعطیلات قریب ہیں میں بھی چلوں گا"۔

"نہیں بیٹا! تم مجھ دُکھیا کے ساتھ کیوں پریشاں ہوتے ہو"۔ سلمےٰ نے جواب دیا۔

دوسرے روز وہ زبردستی سلیم کو تنہا چھوڑ کر جہانگیر آباد روانہ ہوگئی۔

سلمےٰ کشتی سے اُتر کر جہانگیر آباد پہنچی۔ اور شمشاد کے عالیشان مکان میں داخل ہوگئی۔

شمشاد ابھی بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ آہ سلمےٰ کی آنکھوں نے دیکھا کہ اس کا خوابِ نشاط ایک حسین و پرشباب دوشیزہ کی کیف ارزانیوں میں شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔

"شمشاد!" سلمےٰ نے گرج کر کہا "وفادشمن شمشاد! مجھے پہچانا۔"

"نہیں!" اس نے گھبرا کر سلمےٰ کو دیکھا "تم کون!——گھر میں کیسے گھس آئیں"۔

سلمےٰ کو غش آگیا۔ وہ شمشاد کے پاؤں میں جا گری۔ اسے گھنٹوں ہوش نہ آیا اور جب ہوش آیا تو اتنا کہا۔

"عورت کی ہر ادا قابلِ پرستش ہے۔ جب تک کہ وہ حسین ہے"۔

اُس نے ایک ہچکی لی۔ اور ہمیشہ کے لئے مرد کی جفاکوشیوں پر خاموش ہوگئی۔

مظلوم دُنیا

سچ ہے مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ میری تباہیوں کا سلسلہ لامتناہی شاید مجھے قبر میں ہی سلا کر ختم ہو تو ہو۔ بلکہ اب تو اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ ؏

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

بچپن کی خوش وقتیاں اور میکے کا سکھ چین اب خواب پریشاں معلوم ہوتا ہے۔ والدہ مرحومہ اور ابّا جان جو مجھے اپنا حاصلِ زندگی سمجھتے تھے۔ جو میری خوشنودی کے لئے اپنا دن کا آرام اور رات کی نیندیں لٹاتے تھے۔ جو میری مسرّت کے لئے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی پانی کی طرح بہاتے تھے۔ اب میری دُکھ بھری زندگی، میری خونفشانیوں اور میری پریشانیوں سے بے نیاز گوشۂ قبر میں پڑے ہیں۔ انہیں کیا خبر! کہ جس الماس کی معمولی سی برہمی، انہیں تڑپا دیا کرتی تھی۔ اب اس بدنصیب پر فلک بے مہر کیا کیا مظالم ڈھا رہا ہے۔

وہ کیا جانیں! کہ جس الماس کی ناز برداری پر وہ اپنے بڑھاپے کا چین نثار کرتے تھے۔ اس الماس سے اب اس بھری دنیا میں کوئی حال دل پوچھنے والا بھی باقی نہیں۔

آہ! میری شادی کا منحوس وقت ہی میری بربادیوں کا آغاز تھا۔ والدین کی آغوش راحت سے جدا ہو کر میں نے پھر کبھی عیش و سکون کا منہ تک نہ دیکھا۔ کتنے اہتمام اور کس قدر شان و شوکت سے میری اس مصیبت بھری زندگی کا دلفریب آغاز ہوا۔ کیسی تلاش و جستجو کے بعد میرے شریک حیات کا انتخاب کیا گیا لیکن ان تمام پیش بندیوں، احتیاط اور دور اندیشی پر تقدیر خندہ زن تھی۔ شادی کے بعد جلد ہی والد محترم اور کچھ عرصہ بعد والدہ محترمہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئیں۔ مجھے شادی کے بعد ان کی عارضی جدائی کا صدمہ ابھی نہ بھولا تھا۔ کہ اس دائمی مفارقت سے مجھ پر رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس موقع پر بجائے اس کے کہ مجھے بہلایا جاتا۔ میری دلجوئی کی جاتی۔ میرے ساتھ دُکھ بٹایا جاتا۔ ظالم اختر کی ستم ظریفانہ ہنسی نے زخموں پر اور نمک پاشی کی۔ اور سچ پوچھو تو اس دن سے ہی اس کی طرف سے میرا دل سرد ہو گیا۔ وہ خوش تھا کہ ہزاروں لاکھوں

کی جائیداد اسے مل گئی تمام مال و منال اور جائیداد پر تسلّط پاتے ہی بد دیانت اختر نے وہ کم ظرفی کا ثبوت دیا کہ میرا دل خون ہو کر رہ گیا۔ وہ دُنیا بھر کی عیاشیوں میں دولت پانی کی طرح بہانے لگا۔ میں خون کے گھونٹ پی پی کر زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ گھر بھر میں نند صغرا کے سوا میرا کوئی بھی راز دار نہ تھا۔ اس بیچاری کی زندگی مجھ سے زیادہ آلام بھری تھی۔ ساس کے ظلم و ستم سے ایک سال کی دلہن میکے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بے حیا شوہر نے اس معصوم کو نامعلوم قصور کی پاداش میں گھر سے نکال دیا تھا۔ ہم دونوں بیٹھ کر اپنا دُکھ درد بٹایا کرتیں۔ رو دھو کر اپنا دل ہلکا کر لیا کرتیں۔ ایک دوسرے کو تسلّی تشفّی دینے کی کوشش کرتیں اور یوں کچھ اچھا بُرا وقت کٹ جاتا۔ گھر میں اختر کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ ہمارے کہنے کا اس پر خاک بھی اثر نہ ہوتا۔ اُلٹا مار پیٹ کر چلا جاتا۔ اور مہینوں گھر نہ آتا۔ اس لئے ہم نے مجبوراً چُپ سادھ لی۔ دولت بے انتہا تھی۔ لیکن ان بے پناہ عیاشیوں اور خرابات کے آگے اگر قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو ختم ہو جاتا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ دو سال کے بعد جائیداد کا صفایا ہونے لگا۔ آخر جائیداد بھی ختم ہو گئی قرضہ پر نوبت پہنچی۔ اور تھوڑے دنوں میں ہی قرضہ کی بھرمار ہو گئی۔ رہائشی مکان پر سے بھی چار ہزار روپیہ اُٹھا کر اختر نے اپنی یہ چلنی کی

تندر کر دیا۔ قرضخواہوں نے تنگ کرنا شروع کیا۔ خانگی خرچ تک کا گذارہ نہ رہا۔ ہماری فاقوں سے گزرنے لگی۔ صغرا کے ماموں کے طفیل کچھ بُری بھلی گذر اوقات ہو رہی تھی۔ اختر یہ حالت دیکھ کر حواس کھو بیٹھا۔ اس کا توازن دماغی بگڑ گیا۔ اور وہ پاگل ہو گیا۔

انہی دنوں صغرا کے ماموں زاد بھائی کی شادی کا اہتمام شروع ہُوا اس تقریب پر ہم دونوں کو مدعو کیا گیا میرا دل دُنیا سے اس قدر سیر ہو چکا تھا۔ کہ میں باوجود صغرا اور اس کے ماموں کے اصرار کے نہ گئی۔ صغرا کو بادل نخواستہ شامل ہونا پڑا شادی کے اختتام پر صغرا لوٹی تو اس نے زرینہ سے ملاقات کا ذکر کیا۔ زرینہ سیالکوٹ کی ایک مشہور و معروف طوائف تھی۔ اسے شادی پر خاص طور سے بلایا گیا تھا۔ اور وہاں صغرا سے اسے اُنس سا پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ دن بعد زرینہ کا خط موصول ہُوا جو بہت دلچسپ تھا۔ صغرا نے اس کا جواب لکھا اس کے بعد دوسرا خط ملا۔ جس کے جواب میں صغرا نے میرے مشورہ سے تحریر کیا۔ کہ وہ اپنی آپ بیتی لکھے۔ زرینہ کا پہلا خط ہم نے فوراً ہی جلا دیا۔ دوسرے خط کا جواب پوسٹ کرنے کے بعد اسے اطمینان سے پڑھ رہی تھیں کہ اچانک بلائے ناگہانی کی طرح اختر آ نازل ہُوا۔ ہم نے خط چھپانے کی کوشش کی وہ

ایک وحشی درندے کی طرح جھپٹا اور خط چھین کر پڑھنا شروع کیا۔ ہماری روح قبض ہو رہی تھی۔ اس نے خط پڑھتے ہی ساتھ کے باورچی خانہ سے چھری اُٹھائی اور ہم پر حملہ کر دیا ہم دونوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن آہ! صغرا بیچاری اس ظالم کے ہتھے چڑھ گئی۔ میں نے کمرہ میں پہنچ کر کواڑ لگا دیئے۔ یکایک مجھے صغرا کی دلدوز چیخ سُنائی دی۔ میں نے بدحواس ہو کر دروازہ کھولا۔ اور ایک چیخ کے ساتھ بیہوش ہو گئی میں نے کیا دیکھا۔ اُف! مجھ سے نہ پُوچھو۔ میں نے اپنی ان مکروہ آنکھوں سے مظلوم صغرا کا گلا کٹا دیکھا۔ فرش زمین پر خون کا دریا رواں تھا صغرا کی لاش سرد ہو چکی تھی۔ اور خونخوار اختر خون آلود چھُری ہاتھ میں لئے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی ہوش نہ رہا۔ ہاں جب ہوش آیا تو میں پولیس کی حراست میں ایک چارپائی پر پڑی تھی۔ میری آنکھیں کھلتے ہی پولیس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کے بعد کیا ہُوا۔ معصُوم صغرا جنت کو سدھار چکی تھی۔ اصغر پھانسی کی کوٹھڑی میں بند تھا۔ میں قسمت کی ماری در در کی ٹھوکریں کھانے اور یہ سب جانکاہ سہم آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ درگور تھی۔ اس حادثہ سے ایک ہفتہ کے بعد زرینہ کا خط صغرا کے نام موصُول ہوا یہ خط سوسائٹی کے مہذب ڈاکوؤں۔ مذہب

کے بدنام کنندگان اور قدرت کے ان ننگِ انسانیت افراد کا کچا چھٹا ہے۔ جو بظاہر تو بڑے بھلے مانس اور بگلے بھگت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن باطن میں ان کی زندگی اتنی بھیانک۔ تاریک اور ہولناک ہوتی ہے۔ جس سے شیطان بھی پناہ مانگے۔ مذہب کے پاکیزہ دامن کو ان ہوس پرستوں نے داغدار بنا رکھا ہے۔ دُنیا کا کوئی مذہب بھی وحشت۔ بربریت اور ظلم کی تعلیم نہیں دیتا۔ اور اگر حقیقت میں کسی مذہب کے اصولوں میں یہ چیزیں دخیل ہوں تو وہ مذہب مذہب نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں ہر مصلح نیکی اور مساوات کا درس دینے کے لئے آیا۔ عورت کے حقوق بحیثیت انسان مرد سے ہر طرح مساوی ہونے چاہئیں۔ لیکن نام نہاد سوسائٹی نے جس کے افراد محض خواہش کے پُتلے ہوتے ہیں۔ مذہب کے نام پر اپنا اُلّو سیدھا کیا۔ عورت کو اپنی خواہشات نفسانی کا آلۂ کار۔ بچّے پیدا کرنے کی مشین اور گھر کی لونڈی کے سوا کوئی اہمیّت نہ دی۔ اس کی تعلیم کے ذرائع مسدود کر کے اسے پردۂ جہالت میں رکھنے کی کوشش کی تاکہ وہ ترقی نہ کرنے پائے۔ اور علم کی روشنی میں اپنے جائز حقوق کی نگہداشت نہ کر سکے پردے کا ڈھونگ رچا کر اسے گھر کی چار دیواری میں مقیّد رکھا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی مطیع اور غلام بنی رہے۔ اس کے علاوہ

عورت پردہ وہ ناجائز اور قبیح پابندیاں عائد کی گئیں کہ اس بیچاری کی زندگی ایک مرغ قفس کی سی ہو کر رہ گئی۔ اس پر وہ وہ شرمناک مظالم توڑے گئے جن کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مرد عمر بھر کی معصیت کاری کے باوجود معصوم اور کنوارہ کہلاتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے بیچاری عورت کو اگر کسی نامحرم کے ساتھ بے حجاب دیکھ لیا جائے تو وہ راندۂ درگاہ ہو جاتی ہے۔ یہ خط بہت حد تک مرد کی حیوانیّت اور ہوسرانیوں کا آئینہ دار ہے جسے میں اپنی سادہ لوح بہنوں کی عبرت آموزی کے لئے ان بہائم صفت افراد کا پول آشکار کرنے کے لئے۔ عورت مظلوم عورت کی قابل رحم حالت پر دُنیا والوں سے نہیں قدرت سے رحم کی بھیک مانگنے کے لئے من وعن درج کرتی ہوں۔

صغرا! تمہارے اس خط نے میرے مندمل زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا ہے۔ تم نے ماضی کا قصہ چھیڑ کر میرے دل کے داغوں کو از سرِ نو ہرا کر دیا۔ تم مُصرّ ہو کہ میں اپنی داستان غم دہراؤں۔ تمہیں اپنی عفّت سوزی کا حال سناؤں۔ اپنی جہنمی زندگی کی سرگذشت لکھوں۔ بھولی صغرا۔ جاؤ۔ ان جھنجٹوں میں نہ پڑو۔ معصوم صغرا! چھوڑو اس بگڑے ساز کو نہ چھیڑو۔ خوش نصیب سکھی۔

جانے دو اس پاپن کی بپتا نہ سُنو۔

نہ جانے تم مجھ سے کیوں مانوس ہوتی جا رہی ہو۔ مجھ سے کیوں ہمدردی جتا رہی ہو۔ دُنیا کی ایک ٹھکرائی ہُوئی ہستی سے تمہیں کیوں التفات پیدا ہو رہا ہے۔ میں تو تم سے خط و کتابت ترک کرنے پر تلی ہُوئی تھی۔ میں خائف تھی۔ کہ ہمارے تعلقات کا افشائے راز سوسائٹی کی نظروں میں تمہیں بدنام نہ کر دے۔ مجھ پاپن کی آشنائی سے کج فہم دُنیا والوں کو تمہاری پاکیزگی اور عصمت مآبی کے متعلق شکوک نہ پیدا ہو جائیں۔ مگر تم ہو، کہ میرے ارادوں کو توڑنے پر کمر باندھ رکھی ہے۔ روز بروز مجھ سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی ہو۔ میرے دل کی گہرائیوں کا حال معلوم کرنا چاہتی ہو۔ میری آپ بیتی سُننے کی شائق ہو۔ میری آلودۂ معصیت گھناؤنی زندگی کا راز جاننا چاہتی ہو۔

ہاں تم نے مجھے محبّت کا واسطہ دیا ہے۔ محبّت! —— ہا ہا ہا —— بھولی صغرا! میں تمہارا یہ فقرہ پڑھ کر بے اختیار ہنس پڑی۔ تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میرا دل قدر و قیمت محبّت سے بیگانہ ہے۔ لیکن ہاں —— پانچ سال تک متواتر ہوس پرستوں سے اس پاکیزہ نام پر فریب کھاتے کھاتے اب میرے نزدیک یہ لفظ لایعنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اب اس لفظ سے مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔

اب میں اسے ہوسرانی کے مترادف سمجھتی ہوں - اب یہ لفظ سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں - اب اس لفظ کی سماعت سے میری روح کانپنے لگتی ہے - اب اس لفظ کے احساس سے میری آنکھوں کے سامنے وہ تمام مکروہ - بھیانک اور گناہ آفریں صورتیں پھر جاتی ہیں - جنھوں نے مجھے زر و مال سے مطیع ہوتا نہ دیکھ کر اس خوبصورت نام پر خریدا - اپنی مطلب برآری تک مجھے ہر ممکن طریقہ سے اپنی پاکیزگیٔ نفس کے دھوکا میں رکھا - آخر کار موقع پا کر میری عصمت پر ڈاکہ ڈالا - اپنی ...... کا مظاہرہ کیا - اور اس کے بعد ان محبّت کے نام نہاد پجاریوں، ان خواہش کے بندوں، ان شہوت پرستوں کی کہیں شکل تک دکھائی نہ دی - میں ان تلخ تجربات کے باوجود اپنی سادہ لوحی سے پانچ سال تک ان حریص انسانوں سے اس "محبّت" کے نام پر پیہم دھوکے کھاتی رہی اور ان بدباطنوں کی چیرہ دستیوں کا شکار بنی رہی -

تو کیا اس کے بعد تم سمجھتی ہو کہ آج بھی مجھے کوئی اس "محبّت" کے نام پر فریب دے سکتا ہے - غلط ہے غلط آہ — آہ! اب میں محبّت کو معصیّت کا خوبصورت نام سمجھتی ہوں، مجھے اس

سے نفرت ہی نہیں بلکہ فطرتاً کد ہو چکی ہے۔ اس پانچ سالہ تجربہ کے بعد آج میں اسی "لفظ محبّت" کو اپنے مشتریوں سے مال اینٹھنے کا آلہ بنا چکی ہوں۔ اب اس لفظ کے استعمال سے میرا بازار گرم رہتا ہے۔ شب و روز زر برستا ہے۔ ہزاروں نوجوان اس مرض میں، اسی تمنائے خام میں میرے صید بنے ہوئے ہیں۔ مال و دولت تو کیا مجھ پر اپنی جان تک نچھاور کرتے ہیں۔ اور میں —— میں ان کی حماقت پر دل ہی دل میں ہنستی ہوں۔ اپنا جادو چلتا دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔ اپنے انتقام کی تکمیل پر مسکراتی ہوں۔ اوہو —— میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ معاف کرنا صغرا۔ میں اپنے درد بھرے جذبات کی رو میں بہہ گئی ہوں۔ میں نفس مضمون سے بہت پرے بھٹک گئی ہوں۔ تم معصوم ہو۔ تمھیں ان باتوں کا کیا علم! تم ان گورکھ دھندوں کو کیا جانو! آہ! خدا تمھیں ان عفریّت زادوں کی دست بُرد سے محفوظ رکھے ہاں تو تم میری روداد غم سُننے کے لئے اس قدر کیوں بیقرار ہو۔ تم میری دکھ بھری زندگی کی تلخیوں کی کیوں حصّہ دار بننا چاہتی ہو۔

صغرا۔ خدا را میری ان بہکی بہکی باتوں سے دل شکستہ نہ ہونا تمہارے سر کی قسم جو مجھے تمہارے خلوص محبّت پر شُبہ ہو! تم

میری ...... یا اللہ کیا کہوں ...... صغرا۔ کاش میں تمھیں بہن جیسے پیارے نام سے مخاطب کر سکتی۔ لیکن آہ! میں پاپن تم جیسی پاک طینت ہستی سے اس تخاطب کی کیسے جرأت کر سکتی ہوں۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ میری مُردہ دلی جس کے لئے دُنیا میں کوئی دلچسپی بھی باقی نہیں رہی تھی۔ تم سے کیوں مانوس ہوتی جا رہی ہے۔ یاد کرو۔ آج عرصہ دراز کے بعد میں پھر اپنی بے کیف روح میں ارتعاش محسوس کر رہی ہوں۔ تمہاری یاد مجھے اکثر بے چین کر دیتی ہے۔ تمہاری نگارش لطیف سے میں سکون پاتی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہیں دھوکا میں نہیں رکھنا چاہتی۔ مجھ سے محبّت کی توقع نہ رکھنا۔ میں تمھیں چاہتی ہوں۔ میں تمہیں اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں لیکن اس "محبّت" کے لفظ کو درمیان میں نہیں لانا چاہتی۔ گویا یوُں سمجھو کہ یہ لفظ مجھے راس نہیں میں تمہیں اپنے ہاتھوں کھونا گوارا نہیں کرتی۔ اچھا! تو تم میری روداد حیات سُننا چاہتی ہو۔ بہتر ہوتا اگر تعلقات کے خوشگوار آغاز میں یہ تلخی دخیل نہ ہوتی۔ ابھی گذری ہی کتنی ہے۔ پھر کسی موقع پر یہ قصّہ بھی طے پا جاتا۔ لیکن تم مُصر ہو۔ کیا کروں۔ نہ جانے تمہاری کبیدگی میں کیوں برداشت نہیں کر سکتی ابھی ہماری آشنائی کو بھی

تو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ صغرا! تم کتنا جلد گھل مل گئی ہو۔ پیاری! میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی۔ مجھے تم سے اپنے حالات بیان کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ بلکہ میں تو اس رازداری کو تعلّقات کے استحکام کا موجب سمجھتی ہوں۔ مجھے ایک گونہ مسرت ہے۔ کہ تم حسّاس ہو ہمدرد ہو۔ لیکن میں خائف ہوں کہ تمہیں یہ واقعات سُننے سے خوشی نہ ہوگی۔ تمہیں ان سے رنج و غم کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اور میں اپنی تلخیوں اور کلفتوں میں کسی فراغ ہستی کو شریک کرنا نہیں چاہتی یا یوں سمجھو کہ تمہاری پریشانی مجھے منظور نہیں لیکن اچھّا سُنو۔

اپنی پیدائش کے حالات میں کیا جانوں! ہاں جب ہوش سنبھالا۔ تو ایک صاحب کو میں اپنے ہاں اکثر آتا دیکھا کرتی تھی۔ جو متوسط عمر کا نہایت شکیل جوان تھا۔ اور بڑے ٹھاٹھ سے آیا کرتا تھا۔ شکل و صُورت اور وضع قطع سے امارت ٹپکتی تھی۔ مجھے بیٹی کہا کرتا تھا۔ اور بڑے پیار و محبّت سے پیش آتا تھا۔ میرے لئے ہر پھیرے پہ کھلونے اور کھانے پینے کی چیزیں ضرور لاتا۔ اماں مجھے کہا کرتی تھیں کہ یہ تیرے ابّا جان ہیں۔ اور میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے آمد و رفت قطعاً

ترک کر دی۔ میں نے کئی دفعہ امّاں سے پُوچھا کہ ابّا جان اب ہمارے ہاں کیوں نہیں آتے لیکن بجائے جواب باصواب کے وہ اس موقع پر نہایت مغموم اور رنجیدہ ہو جاتیں۔ اس لئے رفتہ رفتہ میں نے یہ پُوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ جب میں کچھ زیادہ سیانی ہو گئی تو ایک دن میں نے ماں سے پھر یہی سوال کیا۔ کہ وہ میرے ابّا جان کیا ہُوئے۔ وہ بدستور پریشان سی ہو گئیں اور آخر میرے اصرار پر بتایا کہ وہ سوداگری کے سلسلہ میں کہیں باہر گئے ہُوئے ہیں۔ اور اب آنے ہی والے ہیں۔ اب تو میں خاموش نہ ہُوئی۔ اور ہر روز دریافت کرنا شروع کیا کہ ابّا کب آئیں گے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ امّاں نے مجھے بُرا بھلا کہا۔ ایک آدھ چپت بھی رسید کیا۔ اور آئندہ ایسے بیہودہ سوالات کرنے کی صورت میں معقول سزا دینے کی دھمکی دی۔ وقت گذرتا گیا۔ میں بچپن کی فضا سے گذر کر عالم شباب میں قدم رکھ چکی تھی۔ شہر بھر میں میرے حُسن و جمال کا چرچا تھا۔ صبح و شام ہزاروں بوالہوس نوجوان اور بوڑھوں کا ہمارے مکان پر جمگھٹا لگا رہتا ہر ایک ممکن طریقہ سے بج دھج کر آتا۔ سب اپنی امارت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے۔ ایک تو میں نے ایسے تاجرانہ ماحول میں تربیت پائی تھی۔ دوسرے امّاں نے جو مجھے دولت کمانے کا آلہ سمجھتی تھی

ان تمام معصیّت کاریوں اور عشوہ طرازیوں میں بچپن سے ہی طاق کر رکھا تھا۔ اس لئے میں سب کچھ سمجھتی تھی لیکن مجھے فطرتاً ان نامحرم لوگوں سے نفرت تھی۔ میں بجائے کسی کا دل موہنے کے بجائے غمزہ فروشیوں کے ہمیشہ تنی تنی رہتی۔ اور کبھی کسی سے ملتفت نہ ہوتی تھی امّاں نے پہلے تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ دکھائی۔ اور بعد میں مار پیٹ تک نوبت پہنچی۔ تاکہ میں اپنے رویّہ کی اصلاح کروں۔ اور روزی کمانے کا ڈھنگ سیکھوں۔ لیکن مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہُوا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اکثر لوگوں نے نا اُمید ہو کر آنا جانا بند کر دیا۔ مجھے مغرور اور بد دماغ سمجھنے لگے۔ امّاں کے کانوں تک روز مرّہ یہ شکائتیں پہنچنے لگیں۔ ماں جس کی نظریں میرے شباب پر لگی ہُوئی تھیں۔ اور جس کی توقعات مجھ سے وابستہ تھیں۔ میری یہ حالت دیکھ کر مایوس ہو گئی۔ مجھے تنگ کرنے لگی۔ ہر وقت کے کوسنوں اور جھڑکیوں سے میرا ناک میں دم کر دیا۔ خاص کر اس وقت جبکہ اماں نے ایک رئیس زادے سے میری عصمت کی بھاری رقم ٹھہرا کر مجھے اس کے لئے آمادہ کرنا چاہا۔ اور میں نے اسے صاف ٹھکرا دیا۔ تو وہ مجھ سے بد دل ہو کر رہ گئی۔ میری انّا بڑی مہربان اور نیک دل عورت تھی۔ وہ ہمیشہ میری تائید وحمایت

میں رہتی اور ہر طرح میری دلجوئی کا خیال رکھتی تھی۔ گھر بھر میں لے دے کر ایک وہی میری راز دار تھی۔ جس سے میں کچھ اپنا درد دل کہہ کر بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھی۔ ایک دن اس سے باتوں باتوں میں ابّا جان کا ذکر چھڑ گیا۔ انّا نے مجھے بتایا۔ کہ امّاں سے اس کا ناجائز تعلّق تھا۔ وہ سو روپے ماہوار دیتا تھا۔ اور گھر کا سارا خرچ بھی اسی کے ذمہ تھا۔ میری پیدائش کے بعد یہ تنخواہ کا سلسلہ تو ٹوٹ گیا۔ البتہ کبھی کبھار آ کر کچھ خرچ دام دے جایا کرتا تھا۔ لیکن حج سے واپسی پر اُس نے بُرے اعمال سے توبہ کر لی ہے۔ اور اس لئے اب وہ ہمارے ہاں آنا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ میں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور انّا سے اس معاملہ میں امداد کا وعدہ لے لیا۔ میں اپنے دل میں امیدوں کی ایک دُنیا لئے بیٹھی تھی۔ مجھے یقین تھا۔ کہ وہ مجھے کم از کم اس معصیت کاری سے ضرور نجات دلوا دے گا۔ ایک دن موقع پا کر ہم اس کے پاس پہنچیں لیکن خلاف توقع وہ مجھے دیکھ کر بڑا سیخ پا ہوا۔ مجھے فوراً اپنے مکان سے نکل جانے کو کہا۔ اور جب میں رو پڑی تو کچھ سیمین ٹکڑے دے کر دھمکی دی کہ اگر میں نہ گئی تو پولیس کے حوالے

کر دی جاؤں گی۔ میں نے روپے پھینک دیئے اور غصّہ سے جل کر دو چار گرم الفاظ کہتے ہوئے لوٹ آئی۔

ہمارے ابّا کے پاس جانے کا راز کسی طرح امّاں کو معلوم ہو گیا۔ پھر جس بُری طرح انّا اور میں پٹے۔ خُدا ہی جانتا ہے انّا بیچاری کو تو گھر سے ہی نکال دیا گیا۔ اب میں اکیلی امّاں کے قہر و غضب کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ میری زندگی تلخ تر ہوتی گئی اور میں مایوسیوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔

نثار پہلا شخص تھا۔ جس نے اپنی چرب زبانی سے محبّت کے نام پر مجھے مغلوب کیا۔ وہ نوجوان تھا۔ حسین تھا متوسط الحال تھا۔ امّاں نے اس سے کافی روپیہ اینٹھا ہو گا۔ مجھے بھی ہر قسم کی ترغیب دی گئی۔ لیکن میرے خلوص محبّت نے یہ ہرگز گوارا نہ کیا۔ اس محبّت کے دعوے دار نے چھ ماہ کے بعد موقعہ پا کر میری دولت عصمت لوٹی۔ امّاں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ نثار کے مواعید سے میں مطمئن تھی لیکن آہ! اس کے بعد ظالم نثار کی صُورت تک نہ دیکھی۔ اماں جو زمانے کے اتار چڑھاؤ سے خوب واقف تھی۔ جلد ہی معاملہ کی تہ تک پہنچ گئی۔ مجھ سے ڈرا دھمکا کر یہ راز دریافت کر لیا۔ اور اس

کے بعد میرا جو حشر ہوا۔ پناہ بخدا۔ کمبخت نثار نے اپنی اس بدکرداری کو نہایت فخر سے دوستوں میں بیان کیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ صبح سے شام تک لوگوں کا تانتا لگا رہتا جو بھی آتا۔ یہی قصہ لے کر آتا۔ اس حادثہ کا مجھ پر ایسا اثر ہوا۔ کہ میں ایک مہینے تک بستر علالت پر پڑی رہی۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ اس کے بعد میں کسی کے چنگل میں نہ پھنستی آئندہ کسی کا اعتبار نہ کرتی لیکن صغرا میں پانچ سال تک متواتر اس "محبت" کے نام پر دھوکے کھاتی رہی ہاں اب میں سنبھل چکی ہوں۔ اب اسی محبت کے نام پر ہزاروں گھر برباد کر رہی ہوں۔ اماں گذر چکی ہے۔ اور اب میں مایوس و ناکام اپنی تمام عمر اس عصمت فروشی کے لئے وقف کر چکی ہوں میں نے اس قعرِ ذلّت سے نکلنے کے لئے اپنی تمام کوششیں ختم کر دیں۔ لیکن آہ! قدرت نے بھی میرا ساتھ نہ دیا۔ اب مجھے خواب میں بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ کبھی میں اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکوں گی۔ میں جی رہی ہوں۔ محض زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے۔ اور بس۔ بتاؤ۔ بتاؤ اور کیا سنو گی۔ خدا کے لئے میری یہ داستان عبرت سننے کے بعد ان عفریت

زادوں کے دھوکے سے بچنا۔ تم ابھی بھولی ہو، معصوم ہو۔ ان مردوں کی فریب کاریوں سے ناواقف ہو۔ میں مرقع عبرت ہوں۔ مجھ سے درس حاصل کرو —— "زرینہ"

مکافات

ظہور اپنے شبستان میں بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ محفل آراستہ تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ خوش گپیاں اُڑ رہی تھیں دفع الوقتی کے خوشامد خورے دوست نشہ میں جھوم جھوم کر وفا و مودت کے جھوٹے عہد و پیمان کا یقین دلا رہے تھے۔ ظہور امارت کے نشے میں اپنے آپ کو خدا سمجھے بیٹھا تھا۔ وہ مذہب، سوسائٹی اور سماج کو ایک کھیل جانتا تھا۔ اس کے پاس دولت تھی۔ اور بے اندازہ وہ دنیا کی ہر چیز کو خرید سکتا تھا۔ اور دُنیا کی ہر طاقت کو مغلوب کر سکتا تھا۔ وہ کئی دفعہ ایسا کر چکا تھا۔ اسے اس کا تجربہ تھا۔ وہ قدرت کے شدید انتقام سے ناواقف تھا۔ وہ زر و مال ہی کو خُدا سمجھے بیٹھا تھا۔ فرعون کی طرح وہ اکثر تن کر کہا کرتا تھا۔ کہ" ان سیمین ٹکڑوں سے خدا بھی مل

سکتا ہے"۔

رات کافی گذر چکی تھی۔ خوفناک تاریکیاں فضائے عالم پر مسلّط ہو چکی تھیں۔ اور تمام احباب ایک ایک کرکے رخصت! صرف ملازم فرش زمین پہ دیوار کا سہارا لئے اُونگھ رہے تھے۔ ظہور ابھی تک شراب کا گلاس سامنے دھرے نیم بیہوشی کی حالت میں آرام کرسی پہ دراز تھا۔ یکایک رات کی پرسکون خاموشی میں دلدوز چیخوں کی آواز گونج اُٹھی۔ ظہور چونک پڑا۔ وہ دلخراش پکار لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔ نہ جانے اس آواز میں کیا درد بھرا تھا۔ کہ امارت کی آغوش میں تربیت یافتہ ظہور میں جس کے کان صرف انبساط کے قہقہوں سے آشنا تھے۔ متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہ آواز کے تعاقب میں گرتا پڑتا چل پڑا۔ تھوڑی دیر میں وہ گلی کے کونہ پہ ایک مکان کے دروازہ پہ جا کر رُکا۔ اور پھر کچھ سوچ کر اُوپر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے اُوپر پہنچ کر دیکھا "ایک نوجوان عورت کی لاش ایک چھوٹی چارپائی پہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اور دو کمسن بچے جن میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لاش کے سرہانے کھڑے ڈھاڑیں مار مار کر

رو رہے تھے۔ باپ پہلے ہی گزر چکا تھا۔ یہ بیوہ ماں جو محنت و مشقّت سے بچّوں کا پیٹ پالتی تھی۔ نمونیہ کا شکار ہوگئی۔ اب ان یتیم بچّوں کا اس بھری دنیا میں کوئی سہارا نہ تھا۔ قدرت کا عدل و انصاف اور رحم ان کے لئے غارت ہو چکا تھا۔ ننھّے شمس کو ماں کی موت کا صدمہ نہ تھا۔ وہ بھوک کی شدّت سے بلبلا رہا تھا۔ بلقیس کچھ سیانی تھی۔ وہ معصوم شمس کو گلے لگا کر رو رہی تھی۔ ظہور سے یہ عالم نہ دیکھا گیا۔ اس کا سنگین دل بھی پسیجا۔ اس نے بچّوں کو گود میں اُٹھا کر پیار دلاسا دیا۔ اور اُنھیں اپنے گھر لے آیا۔ صبح ہوتے ہی اس نے میّت کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا۔ اور بچّوں کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔

بلقیس جس کا خداداد حُسن آئے دن کی فاقہ کشی اور افلاس و غربت سے ماند پڑا تھا۔ امیرانہ ماحول میں آکر شگفتہ پھُول کی طرح نکھری۔ وہ اب عالم شباب میں تھی۔ اس کا دلکش زریں جمال۔ موزوں خد و خال۔ شیریں گفتار ہر شخص کا دل موہ لیتے تھے۔ اپنے پرائے سب اسے دل سے چاہتے

تھے۔ شہر کے بڑے بڑے رئیس گھرانوں سے شادی کے پیام آرہے تھے۔ لیکن ظہور سب کو صاف جواب دے رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس کی بیوی نے بھی بلقیس کی شادی کا مشورہ دیا لیکن وہ باتوں باتوں میں ٹال گیا۔ پیکرِ معصیّت ظہور بلقیس پر بے طرح مفتون ہو چکا تھا۔ وہ اسے لمحہ بھر کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا۔ بلقیس کا تباہ کن شباب دیکھ کر وہ رات دن اپنی آتشِ ہوّس بجھانے کے منصوبے سوچ رہا تھا۔

رات کی بھیانک تاریکی چھا رہی تھی۔ خوفناک بادلوں کی کڑک دلوں کو ہلا رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکے بارش کی آمد کا پتہ دے رہے تھے۔ ظہور حسب معمول مردانے میں بیٹھا شراب نوشی میں مصروف تھا۔ آج گھر میں سوائے بلقیس اور ایک ملازمہ کے اور کوئی نہ تھا۔ اماں سُس معہ بچّوں کے میکے گئی ہوئی تھی۔ ظہور ایک عرصہ سے اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے وہ اُٹھا اور نشہ میں جھومتا جھامتا زنانہ میں آیا۔ اور سیدھا بلقیس کے کمرہ میں جا داخل ہوا۔ بلقیس اپنی مسہری پر جوانی کی مدہوش کن نیند

میں کھوئی ہوئی دُنیا وما فیہا سے بے خبر پڑی تھی۔ ظہور شیطنت کا مجسمہ ظہور لڑکھڑاتا ہُوا آگے بڑھا۔ وہ شہوت کے غلبہ سے اندھا ہو رہا تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھ کر دیر تک اس حُسن کی دلوی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ آخر اس نے اپنے گستاخ ہاتھوں سے رضائی کھینچ کر ایک طرف پھینک دی اور جُھک کر بلقیس کے گلابی رخساروں کو بوسہ دیا۔ وہ معصوم ابھی تک سوئی پڑی تھی۔ ظہُور کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہُوئی تھیں۔ اور وہ ارتکاب گناہ کے لئے بے قرار تھا۔ اس کی آنکھوں پہ ہوسرانی کی پٹی بندھ چکی تھی۔ وہ وارفتگی کی حالت میں بلقیس پر گر پڑا۔ اور اسے اپنے دونوں مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں لے لیا۔ وہ نیند سے چونک پڑی۔ اس کے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی وہ سراسیمگی سے ظہور کو دیکھنے لگی۔ آہ! اس نے کیا دیکھا ——— وہ معصوم جسے اپنا باپ سمجھ رہی تھی۔ اسی ملعون کو شیطانی بھیس میں پایا۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ جان چھڑا کر بھاگ نکلوں لیکن اس ظالم کے پنجہ سے رہائی نہ ہوسکی۔ اور آخر وہ کچھ ہوا جس کے نام سے انسانیت کانپ اُٹھتی ہے اور شرافت

لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے۔ بلقیس کی پاکیزہ عصمت اس ہوس پرست انسان کی بھینٹ چڑھ گئی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہوس رانیوں کا شکار ہو کر رہ گئی۔

ایک سال کا عرصہ گذر گیا۔ اور اب وہ وقت آن پہنچا۔ جب ظہور کی حیوانیت کا ظہور بلقیس کے حمل کی صورت میں ہوا — بے گناہ بلقیس سماج والوں کی لعنت و پھٹکار کا نشانہ بن گئی۔ ظہور کی بدکرداری اظہر من الشمس تھی۔ لیکن وہ سرمایہ دار تھا۔ اسے کسی نے بھی نہ پوچھا الماس پر بھی اپنے شوہر کی بے حیائی بخوبی آشکار تھی لیکن اس کے باوجود وہ بلقیس کو ہی کوس رہی تھی۔ الماس نے اسے صرف کوسنے ہی نہ دیئے بلکہ مار پیٹ کر گھر سے بھی نکال دیا۔

خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس واقعہ کے چار ماہ بعد ظہور کی اکلوتی بیٹی سلیمہ کو بھی حمل کے آثار نمودار ہوئے اور جب اس سے ڈرا دھمکا کر پوچھا گیا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ مجھے شمس سے عشق ہے۔ میں اس کی ہو چکی ہوں۔ سلیمہ کے اس بیان سے بھلا ظہور اور اس کی بیوی کب مطمئن ہو سکتے تھے۔ وہ شمس پر برس پڑے۔ ان کے غصّہ کی آگ صرف اسی طرح سرد

نہ ہوئی بلکہ ظہور نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر شمس کو جیل بھجوا دیا۔ سلیمہ پر اس حادثہ کا بہت برا اثر پڑا۔ وہ شمس کے بغیر زندہ نہ رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ چند دن بعد ہی اس نے خودکشی کر لی۔ الماس اپنی اکلوتی بیٹی کے غم میں گھل گھل کر مر گئی۔ ظہور بھرے گھر کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ وہ گھر بار چھوڑ کر دیوانوں کی طرح گلی کوچوں کے چکر کاٹتا رہتا۔ بچے اسے پاگل پاگل کہہ کر چھیڑتے۔ لوگ اس کی بربادی پر کف افسوس ملتے اور قدرت اپنے انتقام کی تکمیل پر مسکرا رہی تھی۔

ترغیب

سعید کی سرد مہری سے میرا دل اتنا سرد ہو چکا تھا۔ کہ مجھے مردوں سے نفرت سی پیدا ہو گئی۔ اور میں نے تمام عمر بھر شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا۔ میں اسے چاہتی تھی اسے مجھ سے نفرت تھی۔ میں اسے پوجتی تھی۔ وہ مجھے ٹھکراتا تھا۔ اس پر بھی میں مایوس نہ ہوئی۔ اور اپنی تمام عمر اس کی یاد میں وقف کر دینے کا عہد کر لیا۔ لیکن آہ اس نے شادی کر کے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میرے خرمن تمنّا پر بجلی گرا دی۔ میری آرزوؤں کو برباد کر دیا۔ میری حسرتوں کو کچل دیا۔ مجھے جیتے جی موت کی آغوش میں دھکیل دیا۔ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اتنا بے حس انسان ہو گا کہ اسے میرے جذبات اور قربانیوں کا احساس تک نہ ہو گا۔

اس حادثہ سے میرے دل پر ایک چوٹ لگی۔ جگر سے ایک

ہُوک اُٹھی۔ اور اس انقلاب سے میری دُنیا بدل کر رہ گئی۔ میں اس منزل میں تھی۔ جہاں انسان احساسات کھو بیٹھتا ہے۔ اور دیوانہ ہو جاتا ہے۔ مجھے دُنیا اور دُنیا والوں سے نفرت ہو چکی تھی۔ میں زندہ تھی۔ لیکن مُردوں سے بدتر۔ میری زندگی موت کی بھیانک تاریکیوں سے بھی زیادہ تیرہ تھی۔ میں رات دن کُنج تنہائی میں پڑی رہتی۔ آرائش سے غرض نہ نشاط سے کام! والدین میری اس وحشت سے پریشان تھے۔ انھوں نے مجھے نرمی گرمی غرض ہر ممکن طریق سے سمجھانا چاہا۔ لیکن کارگر نہ ہُوا۔

میرا شباب تھا۔ چاروں طرف سے رشتہ کے لئے پیغام آرہے تھے۔ والدین نے میری شادی کرنے کی ٹھہرائی۔ کہ شاید اس طرح یہ روگ جاتا رہے۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ کئی دفعہ میرا ڈاکٹری معائنہ کرایا گیا۔ لیکن کچھ تشخیص نہ ہو سکی۔ ہمجولیوں کے ذریعے مجھ سے اس سوگ کا سبب دریافت کرنا چاہا۔ لیکن میں نے ٹال دیا۔ میرے حُسن و شباب کی رعنائیاں افسردگی و زردی میں بدل کر رہ گئیں۔ میری شوخیاں خاموش ہو گئیں۔ میری آرائشیں مٹ گئیں۔ اور میرا یہ ”سوگ شباب“ سب خاندان کے لئے بدستور چیستان بنا رہا۔

میں کبھی کبھی کنج تنہائی سے گھبرا کر برآمدہ میں جا بیٹھا کرتی تھی۔ اور اپنی روداد محبّت کو دہرایا کرتی! ایک دن عصر کے وقت برآمدہ میں کھڑی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پائین باغ میں رنگا رنگ پھولوں سے قوس قزح کا نقشہ بنا ہُوا تھا۔ اور ان کی بھینی بھینی مست خوشبو مجھے برآمدہ میں دعوتِ کیف و سرور دے رہی تھی۔ لیکن میں ان تمام چیزوں، ان سب لطافتوں سے بے نیاز شفق کے دل افروز نظارہ میں محو تھی۔ کیونکہ میری حالت بہت کچھ اس سے مشابہ تھی۔ میں نامعلوم خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ میرے بال پریشان تھے۔ کپڑے کئی دنوں سے نہیں بدلے تھے۔ نہ جانے مجھے کتنی دیر یونہی کھڑے کھڑے ہو گئی۔ یکایک میری نظر پائین باغ سے ملحقہ سڑک پر پڑی۔ ایک خوشرو نوجوان۔ مردانہ حسن کی تمامتر خوبیوں کا حامل کھڑا ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے کھڑا تھا۔ وہ اتنا مدہوش تھا کہ اسے راہگیروں کے گذرنے کا بھی احساس نہ تھا۔ میری نظریں چار ہُوئیں اور میں فوراً کمرہ کے اندر چلی گئی۔ اندر جاتے ہی میں سب کچھ بھول چکی تھی۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے اس طرح بے اختیار

گھورنے کا خیال تک نہ آیا۔

دوسرے دن والدین کے کہنے سُننے سے میں نے غسل کیا کپڑے بدلے اور پائین باغ میں جا کر ایک بنچ پر بیٹھی۔ میں بدستور اپنے خیالات میں گم تھی۔ میری بنچ اتفاقاً پائین باغ کے صدر دروازے سے منتصل واقع تھی۔ یکایک میں نے دیکھا کہ وہی کل والا نوجوان آیا۔ اور دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی متجسّس نگاہیں مکان کے برآمدہ میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اتنا کھویا ہُوا تھا۔ کہ میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ لیکن وہ مجھے نہ دیکھ سکا۔ وہ کل والا نظارہ دیکھنے کو بیتاب تھا اور اس کی نگاہیں برآمدہ میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ جب وہاں سے اس کی نظریں ناکام لوٹیں تو اچانک مجھ پر نظر پڑی۔ مَیں نے محسوس کیا۔ کہ اس کے پژمُردہ چہرے پر شگفتگی و تازگی آگئی۔ اس کے بے حس جسم میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی نرگسی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ وہ کچھ چھپانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی نمدیدہ آنکھیں اس کے دل کی غمازی کر رہی تھیں۔ وہ سنبھلنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ مجھے اُس کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری۔ وہ میری

تنہائیوں میں مخل ہو رہا تھا۔ میں چیں بہ جبیں ہو کر اُٹھی۔ اور کیاریوں کی طرف چلی گئی۔ میں وہاں دیر تک چہل قدمی کرتی رہی۔ واپسی پر بنچ کے پاس ایک بند لفافہ نظر پڑا۔ اٹھا کر چاک کیا۔ ایک نیلے رنگ کے خوشنما کاغذ پر تحریر تھا۔

ساحرہ! وہ میری زندگی کی پہلی شام تھی۔ میں کل شام تک کتنا بے فکر۔ خوشحال اور سبکدوش تھا۔ لیکن اس انقلاب انگیز شام نے میری دُنیا بدل کر رکھ دی۔ رات ساحرہ سے تصادم کا حادثہ! پناہ بخدا ایک خواب تھا۔ خواب! تم شفق کی پر کیف رنگینیوں میں محو تھی۔ اور تمہارے حُسن کے برق پاش جلوے میرا دل خون کر رہے تھے تمہاری پر شباب سیاہ زلفوں میں حسین چہرہ شب ماہ تاب کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں کتنی دیر اس نظارہ میں کھویا رہا۔ اور تم تجاہل عارفانہ سے شفق کی دلفروزیوں کی طرف ملتفت!

کاش! کچھ دیر اور تم مجھے نہ دیکھ سکتیں۔ تم نے آنکھیں چار کر کے اور ظلم ڈھایا۔ مجھے دُنیا و مافیہا سے کھو کر رکھ دیا۔ کیا بتاؤں رات کتنی بے قراری سے کاٹی۔ صبح سے کتنی دفعہ تمہارے مکان کا طواف کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار مایوس و نامراد لوٹا۔ اب ایک بجے

کا وقت ہے اور بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں اب بھی تم اسی طرح میرے سامنے کھڑی ہو۔ خدا کرے کہیں تمہاری نظر نہ پڑ جاتے۔ ورنہ پھر مجھے مبہوت چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ اُف! غضب ہو گیا۔ آخر تم نے مجھے دیکھ لیا۔ اور روپوش ہو گئیں۔ خدا جانے شام تک اور کتنی دفعہ اس سڑک کے چکر کاٹوں گا۔ اگرچہ یہ پتہ ہے کہ نیاز اسی وقت حاصل ہوں گے۔ کیا جواب خط کی توقع رکھوں؟ جی تو بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے۔ لیکن تمہاری سمع خراشی سے خائف ہوں۔

"ممتاز"

خط پڑھا —— اس کی جرأت و دیدہ دلیری پر تعجب ہوا اور ساتھ ہی نفرت و حقارت کے جذبات برانگیختہ ہو گئے غم و غصہ کی شدت سے دل پر قابو نہ رہا۔ سعید کی آغاز محبت کی تحریریں آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ دیوانوں کی طرح بڑبڑاتے ہوئے خط کو پُرزے پُرزے کر کے پھینک دیا۔ اور گھر جا کر لیٹ رہی۔ میں کئی دن برآمدہ تک بھی نہ گئی۔ ایک دن صبح کے وقت تنہائی سے اُکتا کر برآمدہ میں گئی تو اسے سڑک پر کھڑا پایا۔ اُلٹے پاؤں لوٹ آئی اور آئندہ کے لئے ٹھان لی۔ کہ برآمدہ میں بھی نہ جایا کروں گی۔ تاکہ اس کی منحوس شکل مجھے نظر نہ آئے۔

عرصہ گذر گیا۔ مجھے کئی خطوط کئی طریقوں سے ملے۔ جن میں سے بے شمار تو میں نے بن دیکھے جلا کر خاکستر کر دیے۔ اور چند ایک جو پڑھے ان میں بھی اس کی بیقراری۔ آہ و زاری۔ منتیں۔ قسمیں خودکشی کی دھمکیاں تھیں اور بس —— بیشک اس کی تحریریں ایسی تھیں۔ جو ایک سنگدل کو بھی موم بنا دیتیں۔ ہر خط اس کی ناگفتہ بہ حالت کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ جسے پڑھ کر ہر ذی حس انسان تڑپ اُٹھے۔ لیکن میرے لئے یہ سب کچھ بناوٹ اور تصنع تھا۔ مجھے اس کی درد و گداز سے لبریز تحریریں متاثر نہیں کر سکتی تھیں۔ میرے پہلو میں دل کہاں تھا جو تڑپتا —— میں تو ایک بے حس انسان تھی۔ مجھے کبھی اس کی بے قراریوں کا احساس تک نہ ہوا۔ کئی دفعہ خادمہ نے آکر کہا۔" ایک نوجوان رات سے ہمارے مکان کے سامنے والی سڑک پر کھڑا ہے"۔ ابا جان کو بھی والدہ سے یہ کہتے سُنا کہ ایک لڑکا ہمیشہ سڑک پر کھڑا ہمارے برآمدہ کی طرف تکتا رہتا ہے۔ کئی دفعہ ٹوک چکا ہوں۔ نہ جانے کون ہے۔ اور پھر اماں نے تائید میں کہا۔ ہاں میں بھی جب کبھی برآمدے میں جاتی ہوں اُسے کھڑا پاتی ہوں۔ کوئی دلیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ والد نے میرے

متعلق شک بھی ظاہر کیا۔ لیکن والدہ نے جو میری خلوت گزینی سے اچھی طرح واقف تھی۔ ان کی تسلی کرائی۔ والد صاحب ذہی فہم اور تجربہ کار تھے۔ معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے۔ والدہ کی زبانی ایک دن یہ بھی معلوم ہوا کہ محمد اسلم بیرسٹر کے صاحبزادے ممتاز کے رشتہ کے لئے اس کی والدہ کئی دفعہ آئی ہے۔ وہ بی۔اے میں پڑھ رہا ہے۔ مجھے مجبور بھی کیا گیا۔ کہ رشتہ بڑا اچھا ہے میری رضا ہو تو طے پا جائے۔ لیکن میرے انکار پہ والدہ کو انہیں نفی میں جواب دینا پڑا۔ میں نے خط آنے کے تمام ذرائع بند کر دیے تھے۔ کیونکہ ان خطوط سے مجھے روحانی اذیت پہنچتی تھی ایک دن میں اپنی لائبریری میں بیٹھی ایک مقامی پرچہ دیکھ رہی تھی۔ کہ اچانک خودکشی کے عنوان سے یہ خبر نظر سے گزری۔

لاہور۔ ۱۲ر اگست۔ محمد اسلم خاں بیرسٹر کے اکلوتے بیٹے ممتاز کی لاش ریل کی پٹڑی پر ملی۔ مرحوم کی عمر بائیس برس تھی۔ اور اس سال اس نے بی اے کا امتحان دینا تھا۔ مرحوم کی جیب سے ایک خط ملا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی حسینہ کے عشق میں ناکامی کی وجہ سے خودکشی کر لی۔ ہم وہ خط من وعن درج کرتے ہیں۔

مجھ پر آج یہ ثابت ہُوا کہ کسی سے محبت کرنا اتنا سنگین جرم ہے۔ جس کی سزا موت ہو سکتی ہے۔ مَیں تمھیں کیوں گنہگار ٹھہراؤں اس میں تمہاری کیا خطا! میں نے تمہیں چاہا وارفتہ ہُوا۔ کسی کو محبت کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ میں تمہیں چاہتا تھا۔ اور تمہیں مجھ سے نفرت تھی۔ یہ میری بدقسمتی ہو سکتی ہے۔ تمہارا قصور نہیں کہلایا جا سکتا۔ اقدام میری طرف سے ہُوا۔ اور میں دل سے مجبور تھا۔ اس عرصہ محبت میں صرف تین دفعہ تمہاری دلفریب صورت دکھائی دی۔ تم نے کبھی التفات نہ کیا۔ اور بعد میں میرے خطوط کا جواب تو درکنار جو ان کا حشر ہُوا۔ وہ بھی مجھے معلوم ہوتا رہا۔ یہ چیزیں ایک عقلمند کے لئے کافی سبق آموز تھیں۔ تمہیں مجھ سے نفرت تھی اور تم مجھے دھوکا میں نہ رکھنا چاہتی تھی۔ ایک ذی فہم کے لئے تمہارا یہ رویہ اسے بدلنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن یہاں تو عقل و خرد، ہوش حواس تھے ہی نہیں۔ ایک دیوانہ یہ اشارے اور کنائے خاک سمجھ سکتا ہے۔

انسان جب مایوسیوں اور ناکامیوں میں گھر جاتا ہے جب مستقبل کی خوفناک تاریکیوں میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تو اس وقت موت ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو اسے ان کلفتوں سے نجات

دلا سکتی ہے۔ سب سے خوفناک ظلم دُنیا میں یہ ہے۔ کہ انسان اپنی آنکھوں سے اپنے اخلاص و محبت کا خون ہوتا دیکھے۔ یقیناً یہ چیز ناقابل برداشت ہے۔ تمام ممکن کوششوں کے باوجود جب مایوسی و ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑے۔ تو اس وقت آدمی حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں جب اپنی عزیز ترین ہستی کی طرف سے نفرت کا جواب ملے۔ اور پھر یہ چیز مستقل ہو۔ تو اس ذلیل زندگی سے موت کئی درجہ بہتر ہے۔

دنیا والے خودکشی کو حرام موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ خدا نے انسان پر یہ ایک بڑی مہربانی کی ہے۔ جو اسے یہ حربہ عنایت کیا۔ ایک ناکام محبّت کی زندگی نہ صرف اس کے لئے وبال جان بن جاتی ہے۔ بلکہ سوسائٹی کے لئے بھی بار ہوتی ہے۔ ایک دیوانہ۔ وحشی۔ شرابی ہوتا ہے۔ اور بس چنانچہ اس کی یہ ذلیل زندگی خاندان۔ ملک اور قوم کے لئے ننگ اور کلنک کا ٹیکہ بن جاتی ہے۔ احساسات کھو کر۔ جذبات فنا کر کے ہوش و حواس سے ہاتھ دھو کر انسان انسان نہیں رہتا وہ زندہ درگور ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کی ہستی سوسائٹی کے لئے کیا مفید ہو سکتی ہے۔ افسردگی و یاس کا مجسمہ نہ کسی "بزم نشاط" کے

قابل نہ عیش و سرور کے لائق۔

ع افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

میں حیران ہوں کہ سماج کی طرف سے کیوں کوئی ایسا قانون نہیں بنایا گیا۔ کہ ایسی ہستی کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔ اسے پھانسی دے دینا چاہیے۔ بلکہ اگر وہ خود اپنی اس ذلیل زندگی کا خاتمہ کرتا ہے۔ تو اسے حرام موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حرام موت —— آہا ہا —— ان ظالم سماج والوں کا فتویٰ موت کے بعد بھی انسان کو سبکدوش نہیں ہونے دیتا۔ یہ مرنے کے بعد بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتے یہ عقل کے اندھے انسانی مجبوریوں اور مشکلات کو نہیں دیکھتے۔ اس کی اس حرکت کو بزدلی اور کیا کیا کچھ نہیں کہا جاتا۔ یہ فتاویٰ صادر کرنے والے کمبخت پاجی! اس وقت کون سے جہنم میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب ایک بنی نوع انسان کی زندگی خطرہ میں ہوتی ہے۔ وہ چلاّ چلاّ کر ان کو پکارتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں موت کے عمیق غار کی طرف کھچا جا رہا ہوں۔ للہ مجھے بچاؤ۔ میرا ہاتھ پکڑو لیکن وہ ظالم ایک خندہ دنداں نما، ایک تسکین لغو دے کر اسے چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اکیلا پڑا کراہتا ہے۔ وہ نحیف جان موت کے خوفناک دیو کے آہنی

پنجہ کی گرفت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اور آخر کار موت کی غار کی نذر ہو جاتا ہے۔ پھر یہ ستم ظریف بجائے اس کے کہ اپنی فرعونیت کا ماتم کریں۔ اپنی ہٹ دھرمی اور کج روی کا رونا روئیں الٹا اس کے کیرکیٹر پر بہتان تراشتے ہیں۔

اس وقت میں ایک مختصر سے احاطۂ چمن میں بیٹھا یہ خط لکھ رہا ہوں ۳ بجے کی بمبئی میل ٹرین مجھے زندگی کے اس قعر مذلت سے آزاد کر دے گی۔ میں بشاش ہوں۔ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔ کہ میں اپنے اس مبارک ارادے کی تکمیل کے لئے بیقرار ہوں میں زیادہ خوش اس لئے ہوں کہ میرا یہ فعل اپنے محبوب کی خوشنودی کے لئے ہے۔ میں موت کے حرام حلال ہونے کو لغو سمجھتا ہوں۔ میں اسے ایک بہت بھاری ایثار سمجھتا ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ ہر بزدل انسان یہ اقدام نہیں کر سکتا۔ یہ ایک بہت بڑی قربانی ہے۔ جس کا تصور بھی کم حوصلہ شخص کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔

یہ آخری خط خدا جانے تمہاری نظر سے گذرے یا نہ۔ بہر حال اب مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہر حالت میں اس کا انجام معلوم! بس۔ اب گاڑی کے آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔

مجھے چلنا چاہیے۔ خط اس لئے طویل ہوگیا۔ کہ یہ صبر آزما وقت یوں کٹنا محال تھا۔

ساحرہ! ـــــ شفق کی رنگینیوں کا نظارہ کرنے والی ساحرہ آ ـــ آ ـــ میرے خون کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو یہ اس سے کہیں زیادہ دلفروز منظر ہوگا۔ الوداع!!! کشتۂ محبت۔

"ممتاز"

یہ سب کچھ پڑھا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس نوجوان نامراد کی دلفریب صورت نظروں میں پھر گئی۔ اس کی عظمت میرے دل میں فروغ پا گئی ـــــ دُنیا مجھے یکسر جہنم معلوم ہونے لگی۔ جو میرے جسم وجان کو اپنے آتشیں شعلوں سے جھلس رہی تھی۔ میرا دماغ ماؤف ہوگیا۔ سر چکرانے لگا۔ پاؤں میں لغزش پیدا ہوئی۔ اور میں بے دم ہوکر آرام کرسی پر گر پڑی۔ دیر تک مبہوت وساکت پڑی رہی۔ اس کشتۂ وفا کی تصویر میرے سامنے تھی۔ ریل کی پٹڑی کا منظر آنکھوں میں تھا۔ اور کانوں میں یہ الفاظ گونج رہے تھے "اس ذلیل زندگی سے موت کئی درجہ بہتر ہے"۔ ممتاز میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں نے عالم دیوانگی میں کہا ٹھہرو ـــــ ٹھہرو ـــــ پیارے ممتاز ـــــ

آرہی ہوں ۔ خدا کے لئے ٹھہرو ۔ میں تمہاری مجرم ہوں قاتل ہوں ۔ ظالم ہوں ۔ میں بے اختیار کرسی سے اُٹھی اور پھر لڑکھڑا کر وہیں گر پڑی ۔ اس کے بعد خدا جانے کیا ہوا ـــــ مجھے اس کے بعد ہوش آیا جب دوپہر کو ملازمہ کھانا کھانے کے لئے بلانے آئی ۔ میں نے سر درد کا بہانہ کیا ۔ اور کمرے میں آکر لیٹ رہی ۔

بظاہر دُنیا اور دنیا والوں کی نظروں میں ممتاز کی میں قاتلہ ہوں ۔ میں نے اپنے طرز عمل سے اپنی رکھاوٹ سے اسے مایوس و ناکام کر دیا ۔ میں نے کبھی اس سے التفات نہ کیا وہ میرے دیکھنے کی آرزو دل ہی میں لے کر مر گیا ۔ میں نے اپنی ہر حرکت سے اس کی دلآزاری کے سامان مہیا کئے اور آخر وہ نامراد اپنی خوبصورت جوانی کو میرے تغافل بے جا کی بھینٹ چڑھا گیا ۔ صرف اسی کا خون میری گردن پر نہیں ۔ بلکہ اس کے بدنصیب والدین کی دلدوز آہیں اور اپنے اکلوتے شہزادے کی جوانمرگی کا صدمہ عظیم جو انہیں بمشکل جانبر ہونے دے گا کی ذمہ دار بھی میں ہی ٹھہرائی جا سکتی ہوں ۔ لیکن ـــــ اگر کوئی منصف مزاج انسان میری حالت کا اندازہ کرنا چاہے تو وہ محسوس کرے گا ۔ کہ میں کس قدر حق بجانب تھی ۔

سعید کے ظالمانہ رویہ نے مجھے زندہ در گور کر دیا تھا۔ مجھے محبت کے نام سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ میں مرد کی صورت دیکھنے سے بیزار تھی، میرے نزدیک یہ جنس ہی جھوٹ۔ مکّاری۔ اور فریب کا مجموعہ تھی تو کیا اس صورت میں ان سب باتوں کی ذمہ داری سعید پر عاید نہیں ہوتی؟ وہ ظالم اگر مجھ سے سرد مہری سے پیش نہ آتا۔ اگر وہ مجھے دھوکا نہ دیتا تو یہ واقعات ہی رونما نہ ہوتے۔

عورت اور پھر ہندوستانی عورت ایک ایسی مظلوم ہستی ہے جس کی درخشاں زندگی بھی مرد کی تاریک زندگی سے بدتر ہے۔ وہ ہر جائز حالت میں بھی سوسائٹی کی مجرم قرار دی جاتی ہے۔ جس کے لئے استدلال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ شاید اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے ہی یہ روئیداد لکھنی پڑی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بریت یا معصومیت کا اظہار کر کے سوسائٹی کے انتقاد سے بچنا چاہتی ہوں میرے نزدیک سوسائٹی ایک مجرم جماعت کے چند افراد کا نام ہے۔ اور اس کی میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں!

خونِ تمنّا

شملہ میں وہی چہل پہل ہے۔ جو ہر سال دیکھنے میں آتی ہے اسی طرح مغرب زدہ مہ جبیناں مشرق کے غول غازوں اور ساڑھیوں کی نمائش کرتے ہوئے بازاروں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن نہ جانے میرا دل کیوں اداس ہے۔ مجھے کیوں یہ پرکیف فضا بے کیف سی معلوم ہو رہی ہے۔ مجھے رہ رہ کر اپنے عزیز دوست جمیل کا خیال ستا رہا ہے۔ آہ ـــــ جمیل زندہ دلی اور ظرافت کا مجسمہ تھا۔ اس کے سرخ و نازک ہونٹوں پہ تبسم ہر وقت رقصاں رہتا تھا۔ وہ چار سال سے متواتر میرے ساتھ شملہ میں سیزن گزارتا رہا۔ پچھلے سال بھی حسب معمول میں اپنے جمیل کے ساتھ آغاز گرما ہی میں شملہ آگیا تھا۔

ایک خوشگوار صبح کو میں برآمدہ میں بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا ـــ کہ پیانو کی دلکش آواز میرے کانوں میں آئی۔ مجھے شملہ آئے آج

چار دن ہو گئے تھے۔ اس عرصہ میں آج پہلی دفعہ میں یہ آواز سن رہا تھا۔ میں حیرت و استعجاب سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے زیادہ کاوش نہ کرنی پڑی۔ کیونکہ سامنے والے مکان کے برآمدہ میں جو اب تک خالی پڑا تھا۔ ایک جواں سال حسینہ آرام کرسی پر بیٹھی پیانو بجا رہی تھی۔ اس کی جادو اثر نگاہیں پیانو پر گڑی ہوئی تھیں۔ رات بھر کے پریشان بال جو ابھی تک سلجھائے نہ گئے تھے۔ اس کے گلابی رخساروں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔

میں دیر تک اس مجسمۂ لطافت کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نازک مزاج اس حسین شغل سے اُکتا گئی۔ اس نے پیالہ اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور اپنی پیانو نواز نرم و نازک انگلیوں سے بالوں کو سنوارتے ہوئے حشر خیز نظریں اُوپر کو اُٹھائیں۔ میں جو اس طرح مبہوت کھڑا تھا۔ یکایک نگاہیں چار ہونے سے نہایت شرمندہ ہوا۔ اور فوراً مڑتے ہوئے چہل قدمی شروع کر دی۔ میں بہت دیر تک ٹہلتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اس عرصہ میں وہ مکان کے اندر جا چکی ہوگی لیکن خلاف امید وہ اپنی جگہ پر اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کتاب اُٹھا کر مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ تو محض بہانہ تھا۔ مطالعہ خاک ہوتا۔ دل تو ادھر لگا تھا۔ تھوڑی دیر

بعد دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ تو اتفاقاً وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ پھر آنکھیں چار ہوئیں۔ اور دونوں نے شرما کر نظریں پھیر لیں۔ اسی طرح دو تین دفعہ اتفاق ہُوا۔ اتنے میں وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہُوئے اُٹھی اور کمرہ میں چلی گئی۔ میں دیر تک بُت بنا بیٹھا رہا۔ سارا دن کچھ کھویا سا رہا۔ رہ رہ کر کانوں میں پیانو کی دلنواز صدا گونج رہی تھی۔

دوسرے دن صبح معمول سے زیادہ سویرے اُٹھا۔ اور برآمدے میں بیٹھ کر اس جان تمنّا کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر کے بعد وہ خراماں خراماں برآمدہ میں آئی اور بیٹھ کر پیانو کے دلفریب نغموں میں محو ہو گئی۔ اب روز مرّہ کا یہ شغل ہو چکا تھا۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ کہ خان صاحب سے ہمارے تعلقات قائم ہو گئے۔ جمیل کی خوش گپیوں سے خان صاحب ایسے محفوظ ہُوئے کہ ان کے اصرار پر ہمارا زیادہ وقت ان کے پاس ہی گذرنے لگا۔ جمیل کی سحر گفتگو سے زہرہ بھی اثر پذیر ہُوئی اب ہم تینوں مل کر روزانہ باغ کی سیر کو جاتے اور اس طرح ہمارا کافی وقت خلوت میں کٹتا۔ زہرہ کی لال ڈوروں والی نشیلی آنکھیں گھنگریالے مشکیں بال۔ اور سب سے زیادہ اس کی مترنم شیریں آواز، یہ چیزیں

تھیں۔ جنہوں نے میرے جذبات کی دُنیا میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اس کے ہلکے سے تبسّم میں خدا جانے کیا برقی قوت پنہاں تھی۔ جس نے مجھے از خود رفتہ بنا رکھا تھا۔

ایسے ہی اتفاقات کے بعد ایک دن ہم دونوں باغ کے ایک مختصر احاطہ میں بیٹھے تھے۔ میں نے زہرہ سے کہا زہرہ! تم میرے خوابوں کی تعبیر، میرے جذبات کی دُنیا اور میری تمنّاؤں کا مرکز ہو۔ تمہارے رویہ نے مجھ میں اتنی جرأت پیدا کر دی ہے کہ میں تم سے اظہار محبّت کر سکوں ——— تم نے اگر الفاظ میں نہیں تو آنکھوں سے، چہرے سے، غرض ہر طرح میری محبّت کا گرمجوشی کے ساتھ جواب دیا ——— ہیں تمہارا رنگ کیوں زرد ہوتا جا رہا ہے؟ کیا میرے الفاظ ناگوار گزرے؟ لو میں خاموش ہُوا جاتا ہوں"۔

زہرہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس نے مجھے حسرت سے دیکھتے ہُوئے کہا۔ "آہ شمیم تم جو چاہو کہو۔ تمہیں اختیار ہے۔ لیکن میں اب اس قابل نہیں رہی کہ تم سے اظہار محبّت کر سکوں۔ آہ! محبّت کتنا پیارا نام ہے۔ کیسی اچھی شے ہے۔ لیکن مجھ گنہگار کے لئے نہیں۔ میں ———"

وہ یہاں تک کہنے پائی تھی۔ کہ پھاٹک پر موٹر کا ہارن سُنائی دیا ہم دونوں اس طرف متوجہ ہُوئے۔ خان صاحب اور بیگم خانصاحب باغ میں داخل ہُوئے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی مسکرائے۔ آہا! تم یہاں بیٹھے ہو! کیاریوں کی طرف سے جمیل مسکراتا ہُوا آتا دکھائی دیا۔ زہرہ کی گفتگو سے زیادہ جمیل کی مسکراہٹ نے غضب ڈھایا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ جمیل کی مسکراہٹ ضرور معنی خیز ہے۔ اور اس نے ہماری گفتگو چھپ کر سُن لی ہے۔

رات کی "تاریکیاں یلغار کرتے ہُوئے آ رہی تھیں۔ ہم سب خان صاحب کے موٹر میں بیٹھ کر گھر پہنچے۔ اس رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے دوست جمیل اور زہرہ کے لئے اپنی تمناؤں کا خون کر دوں گا۔ اپنی آرزوؤں کو پامال کر دوں گا۔ اپنے جذبات فنا کر دوں گا۔ اور میری مسرّتوں کی انتہا اُس دن ہوگی۔ جب میں زہرہ کو "بیگم جمیل" کہہ کر مخاطب کروں گا۔

دوسرے دن جمیل کو بخار ہو گیا۔ ہم اُس کی تیمارداری کے باعث باغ بھی نہ جا سکے۔ ڈاکٹر کا علاج شروع کیا۔ لیکن آرام کی بجائے روز بروز اس کی حالت بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ خانصاحب بھی گھبرا گئے۔ ہفتہ دو ہفتہ نہیں کامل دو مہینے گزر گئے۔ اب اسے کھانسی

کی شکایت بھی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اسے "سِل" ہوگئی ہے۔ خان صاحب کے مشورے سے میں نے جمیل کے والد کو تار دیا۔

ایک دن میں بازار سے لوٹا۔ تو ماما نے کہا "آپ کو جمیل صاحب یاد کرتے ہیں"۔ میں فوراً اس کے کمرہ میں گیا۔ اور آہستہ سے پکارا "جمیل۔ جمیل" اس نے آنکھیں کھول کر مجھے لبغور دیکھا۔ اور اپنی نحیف آواز میں کہا "شمیم! شمیم! تم آ گئے"۔ میں کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور کہا۔

"جمیل! خدا کے لئے مجھ سے نہ چھپاؤ۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے کہدو" میں آبدیدہ ہوگیا۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہنا شروع کیا "شمیم جس راز کو میں اپنے ساتھ قبر میں لے جانا چاہتا تھا۔ تمہاری حالت دیکھ کر کہے دیتا ہوں لو سنو۔

مجھے زہرہ سے محبّت ہے۔ لیکن میں اسے تمہاری محبّت پر قربان کر چکا ہوں"۔

میں بیتاب ہو کر چلّا اٹھا "نہیں۔ نہیں۔ جمیل! زہرہ کو تم سے محبّت ہے۔ وہ تمہاری ہے۔ خدا تمھیں صحت دے۔ میں اسے تمہاری آغوش میں دیکھنا چاہتا ہوں"۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش ہونے کو کہا۔ اور بولا "شمیم! خدا کے لئے میرے منصوبے خاک میں نہ ملاؤ۔ میری آخری آرزو کو پورا ہونے دو۔ اور وہ یہ ہے کہ تم زہرہ سے شادی کر لو۔ دیکھو! یہ میری آرزو ہی نہیں بلکہ وصیت ہے"۔

میری آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ کہ زہرہ آگئی۔ مجھے روتا دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اور گھبرا کر جمیل پر جُھک گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ زہرہ نے آواز دی "جمیل" جمیل نے آنکھیں کھول کر زہرہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ جمیل نے زہرہ کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا "مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میرے اور شمیم کے تعلقات کیا ہیں"۔ پھر مجھ سے کہا کہ "جس روز تم زہرہ سے "اظہارِ محبت" کر رہے تھے۔ میں کیاریوں سے گذر رہا تھا۔ بس اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اور اسی پر قائم ہوں۔ زہرہ! میری وصیت ہے کہ تم دونوں شادی کر لینا"۔ زہرہ اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے کہ کمرہ کا دروازہ کھلا۔ جمیل کا والد معہ اپنے چند قریبی رشتہ داروں کے داخل ہوا۔ جمیل کی یہ حالت دیکھ کر دھاڑیں مار کر روتے ہوئے اس سے لپٹ گیا۔ جمیل نے باہیں باپ کے گلے میں ڈال دیں۔ یہ عالم کسی سے بھی نہ

دیکھا گیا۔ سب زار و قطار رو رہے تھے۔ جمیل کی بھی ہچکی بندھ گئی۔ یکایک اسے کھانسی کا دورہ شروع ہوا۔ بہت سا خون گرا اور اس کی حالت غیر ہوگئی۔ میں فوراً ڈاکٹر کو بلا لایا۔ بمشکل اسے والد سے الگ کر کے لٹایا۔ آہ! ایک آخری ہچکی کے ساتھ میرا پیارا جمیل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ مجھے کچھ بھی ہوش نہ رہا۔ آنکھوں میں آنسو سوکھ گئے۔ میرے مُنہ سے وارفتگی کے عالم میں صرف جمیل! جمیل! کی آواز نکل رہی تھی لیکن آہ! اب جمیل قیامت تک نہ بولنے کی قسم کھا چکا تھا۔

نادان دوست

باجی انّا کو خدا پہلو، پہلو جنّت دے۔ بڑی نیک دل عورت تھی۔ مجھے اپنی حقیقی بیٹی کی طرح بڑے پیار و محبّت سے پالا۔ روزانہ رات کے وقت ایک کہانی سُنانا اس کا معمول تھا۔ اور مجھے بھی کچھ ایسی عادت ہو چکی تھی کہ کہانی سُنے بغیر نیند ہی نہ پڑتی تھی۔ اس رات میں کہانی سُننے کے لئے تقاضا کر رہی تھی۔ وہ بولیں "بیٹی! جس قدر کہانیاں یاد تھیں وہ سب تو تمہیں سُنا بیٹھی۔ اب کوئی یاد ہی نہیں تو کیا سُناؤں"۔

میں نے بچّوں کی سی ضد کرتے ہوئے کہا "نہیں۔ نہیں میں تو ضرور کہانی سُنوں گی"۔

جب اس نے مجھے یوں مچلتے دیکھا۔ تو ایک سرد آہ بھر کر کہا "اچھا تو یہ آخری کہانی بھی سُن لو۔ لیکن یہ روز مرّہ کی

من گھڑت کہانیوں کی طرح نہیں۔ بلکہ مجھ دُکھیا کی آپ بیتی ہے۔ اس لئے یہ غور سے سُننا پڑے گی"۔

میں نہایت ذوق و شوق سے ہمہ تن گوش ہوکر سُننے لگی اس نے کہنا شروع کیا۔

"جمیلہ! تمھیں میری موجودہ حالت سے یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا۔ کہ میں بھی کبھی تمہاری طرح حسین و جمیل تھی ذی عزّت تھی۔ لیکن آہ! معصوم جمیلہ! تم ابھی ناسمجھ ہو۔ انقلابات و حوادثات زمانہ سے بے خبر ہو۔ زندگانی کا یہ دور جنت ہے جنت! عہد طفلی کی ملکوتی دُنیا سے نکل کر کارزار حیات میں قدم رکھتے ہی انسان کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں تفکرات دُنیاوی میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ اور زندگی کی الجھنوں میں اُلجھ جاتا ہے۔

میں نواب محمد سعید خاں کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ ابا جان اور امی جان مجھے آنکھ کے تارے کی طرح رکھتے تھے۔ میں نے بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی۔ میری ہر جائز و ناجائز فرمائش پوری کی جاتی۔ غرضیکہ میں سیم و زر میں کھیل کر پروان چڑھی میں نے ہوش سنبھالا۔ تو شہر بھر میں میرے حُسن و جمال کے چرچے تھے ہر طرف سے رشتہ کے لئے پیغام آرہے تھے۔ لیکن ابّا جان

کہیں بھی حامی نہ بھرتے - وہ سب کو یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ ابھی بچی کم سن ہے - لیکن درحقیقت وہ ایسے رشتہ کی تلاش میں تھے - جو اُن سے بہت بڑھ چڑھ کر متموّل ہو - لڑکا شکیل اور تعلیم یافتہ ہو - اور والدین کے مال و املاک کا تنہا وارث ہو - دراصل وہ میرے روشن مستقبل کی تدبیریں سوچ رہے تھے - لیکن تقدیر سر پہ کھڑی مسکرا رہی تھی - سچ ہے کہ تقدیر کے آگے انسان کی حفاظتی تدابیر ہیچ ہیں -

نتیجہ یہ ہوا کہ ابّا جان کے پیہم انکار نے سب کو مایوس و بد دل کر دیا - اس طرح ایک عرصہ گذر گیا - میری جوانی ڈھل رہی تھی - عہد شباب کے ولولے اور ارمان دل کے دل میں ہی گھٹ کر رہ گئے - رہ رہ کر رفیق حیات کی آرزو پیدا ہوتی تھی لیکن نسوانی شرم و حیا اس کے اظہار سے مانع تھا - گھر میں ہر طرح کی عیش و آسائش میسّر تھی - لیکن مجھے اندر ہی اندر ایک نامعلوم غم گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا - حتیٰ کہ میری رعنائی حُسن و جمال ماند پڑ گئی - آنکھوں کی شوخی اور طبیعت کا چلبلاپن جاتا رہا - اور مجھ میں بچّوں کی طرح ضد اور چڑچڑا پن پیدا ہو گیا - میں تنہائی میں ذرا ذرا سی بات پہ پہروں کڑھتی رہتی - رفتہ

رفتہ رفتہ مجھے بخار آنے لگا۔ اور میں سخت بیمار ہوگئی۔ میری بیماری پر ابّا جان نے لاکھوں روپے خرچ کر دیے۔ دُنیا بھر کے طبیب اور ڈاکٹر میرا علاج کر کر کے تھک گئے۔ لیکن مجھے افاقہ نہ ہُوا۔ چھ ماہ کی طویل بیماری کے بعد میری حالت کچھ اُمید افزا ہُوئی۔ لیکن تپ محرقہ نے میرا حُلیہ بگاڑ دیا تھا۔ میرے دلفریب خد و خال اور نقش و نگار مسخ ہو چکے تھے۔ میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ آئینہ دیکھ کر مجھے اپنی شکل سے ہول آتا تھا۔ میرا علاج جاری تھا۔ چند ماہ میں ہی میری کھوئی ہُوئی طاقت تو واپس آ گئی لیکن آہ! ڈاکٹروں اور طبیبوں کی انتہائی کوششیں بھی میری شکل و صُورت بحال نہ کر سکیں۔

میرا بر باوجود تلاش کے نہ مل سکا۔ بالآخر ابّا جان نے اپنے منشی کے ساتھ میرا عقد پڑھا دیا۔ منشی ایک غریب گھرانے کا معمولی شکل و صُورت کا نوجوان تھا۔ وہ اپنے آقا کا حکم رد نہ کر سکا۔ اور پھر درویش بجان درویش مجھے قبول کر لیا۔ شادی کے بعد ابّا جان کی زندگی تک تو اس کا سلوک چنداں بُرا نہ رہا۔ لیکن اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی منشی نے تمام جائیداد اور نقدی پر قبضہ جما لیا۔ اور جائیداد کو چار پانچ ماہ کے

اندر فروخت کر کے بنکوں میں روپیہ جمع کرا لیا۔ کاروبار بند کر کے مجھے اپنے ساتھ بمبئی چلنے کو کہا۔ مجھے بھلا کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہولی۔ یہاں پہنچ کر اس نے مجھے ایک سرائے میں ٹھہرایا اور خود رفوچکر ہو گیا۔

میں کئی دنوں تک اس کا انتظار کرتی رہی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک ہفتہ کے بعد سرائے کے منشی نے آکر کہا۔ کہ بابو جی ایک ہفتہ کا کرایہ دے گئے تھے۔ وہ ختم ہو گیا۔ اب اگر رہنا چاہو تو کرایہ ادا کرو۔ میرے پاس سوائے معمولی زیور کے کچھ نہ تھا۔ ایک ماہ تک سرائے میں مقیم رہی اور اس عرصہ میں وہ زیور بیچ کر کرایہ و خوراک میں ختم کر دیا۔ اس کے بعد میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ کہ کہیں محنت و مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالوں۔

اُس دن سرائے کا منشی آیا اور مجھے کمرہ چھوڑنے کے لئے کہا میں زار و قطار روتی ہوئی باہر نکلی۔ ایک معزز شخص نے میرے نزدیک ہو کر پوچھا۔ "آپ کیوں رو رہی ہیں"۔ میں نے اپنی ساری کہہ سنائی وہ نہایت رحم دل شخص تھا میرے درد بھرے واقعات سن کر وہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ اور تسلی و تشفی دے کر کہا۔

جمیلہ! تجھے معلوم ہے وہ شخص کون تھے۔ وہ تیرے ابا جان ہیں۔ یہی مجھے آج سے بیس سال قبل سرائے سے یہاں لائے تھے۔ اور میں اب تک ان کے زیرِ سایہ ہوں۔

مُجرم

یہ بچپن کا واقعہ ہے۔ میری عمر مُشکل سے بارہ برس ہو گی۔ قبلہ والد صاحب سے ان کے ایک نہایت بے تکلف دوست میر صاحب ایک قِصّہ بیان کر رہے تھے۔ میں پاس بیٹھا بغور سُن رہا تھا۔ مجھے آج تک وہ قِصّہ حرف بحرف یاد ہے اور یاد بھی کیوں نہ ہو۔ جبکہ اس کے اثر سے میں نے اپنی عُمر برباد کر ڈالی۔ ہاں وہ کہہ رہے تھے۔

کل حسب معمول میں عصر کے وقت تفریح کے لئے مال روڈ پر جا رہا تھا۔ کہ مجھے اپنا ایک نہایت پرانا دوست قاسم مل گیا۔ قاسم سے مجھے بارہ سال کے بعد ملنے کا اتفاق ہُوا تھا۔ مجھے اُس کی ابتدائی حالت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ اور نہایت ہی غریب خاندان سے تھا۔ لیکن اس کے دل میں لڑکپن سے ہی بڑا آدمی بننے کا شوق تھا۔ وہ اسی دھن میں بڑے

..... بڑے خیالی پلاؤ پکایا کرتا اور ہوائی قلعے تعمیر کیا کرتا تھا۔ پھر وہ زمانہ بھی مجھے نہیں بھولا۔ جب ہم دسویں جماعت میں پڑھتے تھے ہمارا سالانہ امتحان قریب تھا کہ ایک دن قاسم کے بھاگ جانے کی خبر سُنی۔ اور اس کے بعد اب تک کسی سے بھی اُس کا کچھ پتہ نہ پایا۔ تو حاجی صاحب! کل جس قاسم نامی دوست سے میں ملا۔ وہ وہی مفلوک الحال قاسم تھا۔ لیکن اس کی حالت پہلے سے بالکل مختلف تھی۔ وہ نہایت اچھے لباس میں تھا۔ اور ظاہری شان و شوکت سے بھی بہت امیر آدمی معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے متعجب ہو کر پُوچھا۔ قاسم تم کہاں۔ اتنا عرصہ کدھر رہے۔ اور یہاں کب سے آئے ہو۔ وُہ مُسکرا کر بولا میر صاحب غریب خانہ پر تشریف لے چلئے وہاں آرام سے ساری داستان سُن لیجئے گا۔ یہ افسانہ بڑا طویل ہے۔ اور اس کے بیان کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک عالیشان بنگلہ میں پہنچ کر ٹھہر گیا۔ ہم اس بنگلہ میں داخل ہوئے۔ اور ایک وسیع کمرہ میں جا کر قیام کیا۔ جو ہر قسم کے مغربی سامان سے مزیّن تھا۔ اس نے ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا۔ اور خود ہنستے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے

لگا۔" میر صاحب! میں وہی قاسم ہوں جو کبھی آپ کے ساتھ تعلیم پاتا تھا۔ ہماری غربت کا یہ عالم تھا۔ کہ کئی کئی وقت فاقوں سے گذرتی تھی۔ بچپن سے ہی مجھے اپنی نکبت کا احساس اور اپنی حالت بدلنے کا خیال تھا۔ اور اس جذبہ کے تحت میں نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر مسافری اختیار کی۔ ابتدا میں کڑی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ لیکن آخرکار خداوند کریم نے مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کر دیا۔ اور اب میں آپ کے سامنے اس حالت میں ہوں۔

مجھے یہاں آئے تین مہینے ہو چکے ہیں۔ یہ بنگلہ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے حال ہی میں تعمیر کرایا ہے۔ اس پر چالیس ہزار روپے خرچ بیٹھا ہے۔ اور یہ بنگلہ میں نے اپنے بھائی کو دے دیا ہے۔ اس کے سامنے ہی اس قسم کے دو بنگلے اور تیار ہو رہے ہیں۔ ایک ہمشیرہ کے لئے اور دوسرا اپنی رہائش کے لئے۔

میں نے حیرت و استعجاب سے قاسم کا مُنہ تکتے ہوئے پُوچھا لیکن اتنی دولت تم نے کمائی کیسے۔

قاسم نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہُوئے کہنا شروع کیا۔ میر صاحب! جس وقت میں یہاں سے بمبئی گیا۔ تو میرے پاس

صرف ایک روپیہ تھا۔ جو گھر سے آٹا لانے کے لئے مجھے دیا گیا تھا۔ میں بغیر ٹکٹ ریل میں سوار ہو کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ راستہ میں دو ایک جگہ اتار دیا گیا۔ اور آخر کار بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میرے پاس کھانے کو پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ دو دن تک فاقہ سے رہا۔ تیسرے دن ایک جگہ چار روپے کی ملازمت اختیار کی۔ اور اس کے بعد آٹھ سال تک یہ حالت رہی کہ دو چار مہینے کام لگا تو دس مہینے بیکاری میں کٹے۔ آٹھ سال کے بعد مجھے ایک سیٹھ کے ہاں چوکیداری کا کام مل گیا۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ یعنی بیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ آہستہ آہستہ سیٹھ جی کے گھر میں بھی میری آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان کی ایک اکلوتی لڑکی تھی۔ "ستارہ" نہایت حسین و جمیل! رفتہ رفتہ اسے میں نے اپنے دام میں پھنسایا اور بڑھتے بڑھتے وہ میری گرویدہ ہو کر رہ گئی۔ ایک سال کے بعد ستارہ کی سفارش سے مجھے مہتمم اعلےٰ کی اسامی مل گئی۔ سیٹھ جی کی ستارہ کے علاوہ کوئی اولاد نہ تھی۔ بیوی کو گزرے چار سال ہو چکے تھے۔ خود سیٹھ جی قبر کے کنارے بیٹھے تھے۔ احباب کے مشورہ سے اُنہوں نے ستارہ کی شادی کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ بر کا انتخاب ہوا۔ ستارہ کو جب

اس کا پتہ چلا۔ تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ جوشِ محبت میں یہاں تک کہہ دیا۔ کہ میں قاسم سے ہی شادی کروں گی۔ ورنہ جان دے دوں گی۔ سیٹھ جی کو اس انکشاف سے سخت صدمہ ہُوا۔ اور وہ دس بارہ دن کی علالت کے بعد ستارہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناراض ہو کر عدم آباد کو سدھار گئے۔ اب میدان صاف تھا۔ میرا ستارہ سے عقد ہو گیا۔ اور ہم بمبئی سے فرم اٹھا کر یہاں چلے آئے۔

میر صاحب سے یہ قصّہ سُننے کے بعد میرے دل میں قاسم بننے کے ولولے پیدا ہُوئے اور اسی سال کے اندر اندر میں گھر سے کچھ روپیہ اڑا کر سیدھا بمبئی پہنچا وہاں ایک ماہ تک کام تلاش کیا لیکن کہیں دو روپے ماہوار کی ملازمت بھی نہ مل سکی۔ دوسرے مہینے مشکل سے ایک جگہ ٹوکری اٹھانے کا کام شروع کیا۔ وہاں مجھے چھ آنے روزانہ ملتے تھے۔ جن سے بمشکل میری خوراک کا خرچ چلتا۔ اس کے بعد مجھے ایک کارخانہ میں جوتوں کے تلوے لگانے پر پندرہ روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ ایک سال تک میں نے وہاں کام کیا۔ اس عرصہ میں مالک کی نظروں میں میں ایک اعتباری آدمی بن چکا تھا۔ چنانچہ مجھے بڑھا

لکھا دیکھ کر مزدوروں کے حساب کتاب پر منشی مقرر کر دیا گیا۔ جہاں پچیس روپے تنخواہ پڑ جایا کرتی تھی۔

پانچ سال تک میں وہاں پہ کام کرتا رہا۔ اس عرصہ میں میں نے خاصی رقم جمع کر لی۔ لیکن مجھے تو بڑا آدمی بننے کی دھن سمائی تھی۔ رات دن یہ کوشش تھی کہ کسی طرح سیٹھ کے گھر تک رسائی ہو چنانچہ خوش قسمتی سے میں اس سعی میں کامیاب ہو گیا۔ گھر میں میری آمد و رفت شروع ہو گئی۔ منیم کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ مجھے بڑا رنج پہنچا کہ اگر ایک ہی لڑکی ہوتی تو سارا مال میرے ہی قبضہ میں آتا۔ لیکن پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دی۔ کہ ایک لڑکی کا حصّہ بھی لاکھوں روپیہ بنتا ہے۔ جس سے میں خاصہ امیر کبیر آدمی بن سکتا ہوں۔

ایک دن موقع پا کر میں نے سب سے چھوٹی لڑکی یاسمین کو سکول سے واپسی پہ سیڑھیوں میں پکڑ لیا۔ اور اس سے "اظہار محبت" کرنا چاہا۔ آہ! یاسمین نے شور و واویلا سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ آن کی آن میں سارا گھر جمع ہو گیا۔ میرے حواس گم تھے۔ کہ ایسے میں کروں تو کیا کروں۔ مجھے فوراً دھر لیا گیا۔ منیم کو خبر دی گئی۔ اور مجھے پولیس کی حراست میں دے دیا گیا۔ مقدمہ

چلا۔ مجھے یاسمین پر حملہ کے جرم میں پانچ سال اور یاسمین کے زیورات چھیننے کے جرم میں سات سال قید کی سزا ہو گئی۔

آج پانچواں دن ہے کہ میں بارہ سال کی سزا بھگت کر آرہا ہوں اور اپنی امارت کی ہوس کا فاتحہ پڑھتے ہوئے پھر وہی بوٹوں کے تلوے لگانے کا کام شروع کیا ہے!!!

اوباش

مجھے گوجرانوالہ میں اپنے دوست اظہر کے ہاں مہمان ہوئے آج دوسرا دن تھا۔ بادل برس کر کھل چکا تھا۔ فضا خوشگوار تھی۔ نیلگوں آسمان پر ابر کے چند ہلکے ہلکے ٹکڑے سیمین کشتیوں کی طرح تیر رہے تھے۔ چائے سے فراغت پانے کے بعد ہم سیر کو جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کہ ایک مغربی وضع قطع کا نوجوان قہقہے بھرتا ہوا بے تکلف کمرہ میں داخل ہوا۔ اظہر "ہیلو ڈیر منظور" کہتے ہوئے نووارد شخص کو بڑے تپاک سے ملا۔ اور اس کے بعد اپنے ایک نہایت عزیز و ہم مشرب دوست کی حیثیت سے تعارف کرایا۔

میں اس بلائے ناگہانی کو نازل ہوتا دیکھ کر اپنے تفریحی پروگرام کا فاتحہ پڑھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اُن کی رازدارانہ گفتگو سے لاتعلق ہو کر مطالعہ میں لگ گیا۔ اثنائے مطالعہ میں ان اشرفا کی باہمی گفتگو کی جو بھنک میرے کانوں میں پڑی۔ اس سے میں نے

بخوبی اندازہ لگا لیا۔ کہ نہ صرف منظور بلکہ اظہرؔ اور ان کی سوسائٹی کے دیگر افراد بھی جن کا ذکر کیا جا رہا تھا۔ عام بازاری چال چلن کے آدمی ہیں۔ جو رات دن شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو خراب کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

مجھے اپنے دوست اظہر کی اس افسوسناک ذہنیت سے بڑا صدمہ ہُوا۔ مجھے امیر گھرانوں کے نوجوانوں سے پہلے ہی بدظنی تھی۔ لیکن اظہرؔ کو پانچ سال کی دوستی کے مشاہدہ سے میں ایک شریف۔ پاکباز اور حسّاس نوجوان سمجھ رہا تھا۔ اور آج پہلا موقعہ تھا۔ کہ اظہر کی بھیانک سیرت اپنی ہیئت کذائی کے ساتھ میرے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی۔ میں اپنی غلط فہمی پر دل ہی دل میں جل بھن رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس انکشاف سے میرے شاعرانہ جذبات کو سخت ٹھیس پہنچی۔ کتاب آنکھوں کے سامنے دھری کی دھری رہ گئی۔ اور میں خیالات کی رو میں بہ نکلا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دُنیا میں شرافت کے لباس میں کیسی کیسی مکروہ صورتیں چھپی ہوتی ہیں۔ انسان شرافت کی تلاش میں کتنے شدید دھوکے کھاتا ہے۔ آخر کس کا اعتبار کیا جائے کیا دُنیا سے شرافت بالکل اُٹھ چکی ہے؟ آہ! عورت۔ مظلوم عورت کے لئے ان عفریت زادوں کی دھرتی میں

کہیں بھی جائے پناہ نہیں حُسن اور جوانی لعنت ہے لعنت!

عورت پھر ہندوستانی عورت کے لئے تو یہ نعمت ایک عذاب سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ یہ شیطانی عصمت وعفّت کے ڈاکو باپ دادا کی حرام کمائی سے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے۔ دُنیا میں کوئی قانون ان مہذب اوباشوں اور ڈاکوؤں کے انسداد کے لئے نہیں وضع کیا گیا۔ آخران بہائم صفت افراد کی کثرت سے انجام کیا ہوگا۔ میں اسی سوچ میں تھا۔ کہ یکایک اظہر کی آواز نے میرے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔

اظہر:۔ اختر صاحب! آپ کیا پڑھ رہے ہیں۔ چھوڑیئے مطالعہ کو اور منظور صاحب سے بات کیجئے۔ یہ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ غالباً آپ نے ہماری باتیں ضرور سنی ہوں گی (منظور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آپ اس فن میں نہایت مشّاق واقع ہُوئے ہیں۔

میں نے اپنے اضطراب کو چھپاتے ہُوئے مسکرا کر کہا۔" جی ہاں اگرچہ مجھے آپ کے اس ذوق سے قطعی دلچسپی نہیں۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ مجھے ایک افسانے کا پلاٹ مل گیا۔"

اظہر! "اجی ابھی آپ نے سُنا ہی کیا ہے۔ کبھی اتفاق ہو تو ان سے پوری داستانیں سن لیجئے۔ ان کی آپ بیتی تو اتنی دلچسپ ہے کہ اس سے آپ کئی افسانوں کے پلاٹ اخذ کر سکتے ہیں۔ کیوں بھئی منظور آج وہ "نرملا" والا قِصّہ تو اختر صاحب کو سناتے جاؤ"۔

منظور (گھڑی دیکھتے ہُوئے) "بھئی سات بج چکے ہیں۔ اور ساڑھے آٹھ کی گاڑی سے مجھے شیخوپورہ جانا ضروری ہے۔ تم تو سُن ہی چکے ہو۔ خود ہی اُنہیں سُنا دینا۔

اظہر۔ نہیں نہیں۔ میں تمہاری طرح ادا نہیں کر سکوں گا۔ دوسرا مجھے اس میں سے کئی ایک باتیں بھُول بھی چکی ہیں۔ آج رات یہیں رہ جاؤ۔ صبح موٹر پر چلے جانا۔ آخر اتنی کیا جلدی پڑی ہے۔

منظور۔" اظہر کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہیں تو کہہ چکا ہوں کہ شکار پھانس رکھا ہے۔ میں تو صرف تمہیں لینے آیا تھا۔ مگر تم اختر صاحب کی وجہ سے جا نہیں سکتے۔ لیکن میرا جانا تو ازحد ضروری ہے۔ اچھا تم کھانا منگاؤ میں اختصار کے ساتھ ایک گھنٹہ کے وقفہ میں بیان کئے دیتے ہوں"۔

اظہر ـــــ" بہت خوب! اچھا شروع کرو۔ کھانا آرہا ہے۔

منظور۔ اجی وہ واقعہ یوں ہے۔ کہ میرے ایک دوست تھے شیخوپورہ میں مسٹر فیض ہیڈ کانسٹیبل۔ ایک دن میں ان کے ہاں بیٹھا ایک اہم معاملہ کے ضمن میں مشورہ کر رہا تھا۔ کہ ایک دیہاتی شخص (جو ہمارے قریب ہی رہتا تھا) نے آواز دی۔

"ہجور گھر میں ہیں"۔

ملازم کسی کام کو باہر گیا ہوا تھا۔ فیض نے اُسے اندر بُلا لیا۔ اور تحکمانہ لہجہ میں پوچھا "کیا ہے"؟

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "ہجور آج دو دن سے ہمارے گھر میں ایک لڑکی آئی ہوئی ہے۔ جو نہ جانے کون ہے۔ ہجور کو اطلاع کرنے آیا ہوں تاکہ بعد میں ہم سے کچھ پوچھ گچھ نہ ہو"۔

فیض نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس شخص کو مخاطب کر کے کہا "کتنی عمر کی لڑکی ہے"؟

وہ بولا "ہجور یہی کوئی پندرہ سولہ برس کی ہوگی"۔

میں نے کہا "آج دو دن کے بعد اطلاع دینے آیا ہے۔ گدھا کہیں کا۔ جا اور فوراً اسے اپنے ساتھ لے کر آ"۔

وُہ "بہت اچھا ہجور" کہتے ہُوئے بھاگا بھاگا گیا اور تھوڑی دیر میں اسے ساتھ لئے آ حاضر ہُوا۔

فیض ہونٹ چباتے ہوئے بولا اختر صاحب! کیا عرض کروں کہ وہ کس قدر حسین لڑکی تھی۔ اس کے دلفریب خدوخال۔ گورا رنگ گھنگریالے بال۔ نرگسی آنکھیں۔ پھول جیسے رخسار دراز پلکیں اور زندگی بخش مسکراہٹ زاہد سے زاہد کے خرمن زہد و تقوے کے لئے برق فنا کا حکم رکھتی تھی۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے کرسی پہ بیٹھنے کو کہا۔ اور اس شخص کو ڈانٹ ڈپٹ دکھا کر رخصت کر دیا۔ اب ہمیں فکر دامنگیر ہوئی کہ اس کافرہ کو رکھا کہاں جائے۔ فیض نے اہل و عیال کی وجہ سے معذوری ظاہر کی اور خوش قسمتی سے ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اتنے میں کھانا چنا گیا۔ منظور نے کھانا کھاتے ہوئے کہنا شروع۔ "بس جناب! مختصر یہ کہ اس قتالہ کو ساتھ لے فیض سے رخصت ہو کر میں گھر آیا۔ گھر پہنچ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ بیگم کہیں شادی پر گئی ہوئی ہے۔ اب گھر میں سوائے ملازموں کے کوئی اور نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نرملا خوف سے کانپ رہی ہے۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کھانا کھلا کر بیگم کے بستر پر سلا دیا۔ اور خود اپنی مسہری

پر پڑ رہا۔ نیند کس کو آتی تھی۔ بیتابی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ نصف شب کے قریب میں چارپائی سے اُٹھ کر نرملا کے پاس پہنچا۔ وہ معصومیت کی میٹھی نیند سو رہی تھی۔ اس کا حسن پہلے سے دوبالا ہو رہا تھا۔ میں کچھ شرارت کرنا ہی چاہتا تھا۔ کہ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی میں نے پیار کرتے ہوئے تسلی دی اور کچھ سمجھا بجھا کر اپنے بستر پر واپس چلا آیا۔ رات جوں توں کر کے کاٹی۔ صبح ہوتے ہی میں نے نرملا کو مردانے کی کوٹھڑی میں چھپا دیا۔ گیارہ بجے بیگم تشریف لائیں۔ میں نے دفتر سے رخصت حاصل کر لی تھی۔ بیگم سے ناسازئ طبع کا بہانہ کیا۔ شام کے قریب میں نرملا کو لے کر بیگم کے پاس گیا۔ اور اُسے لاوارث لڑکی بتا کر چند دن اپنے پاس رکھنے کو کہا۔

نرملا اب تک بدحواسی کی حالت میں تھی۔ میرے بیوی بچے دیکھ کر اُس کی جان میں جان آئی ایک دن اور گذر گیا۔ تیسرے دن جب کہ نرملا غسل کرنا چاہتی تھی۔ میں غسل خانہ میں ہاتھ دھونے کے بہانے گیا۔ غسل خانہ مردانے سے ملحق تھا۔ اور اس کے دو دروازے تھے۔ ایک زنانہ کی طرف اور دوسرا مردانہ کی جانب! میں نے پھرتی سے مردانے والے دروازہ کی کنڈی اندر سے کھول دی اور پھر باہر نکلتے ہی سیدھا مردانے میں جاکر

باہر سے کنڈی لگا کر انتظار میں بیٹھ رہا۔

نرملا کے غسل خانے میں داخل ہونے کی آواز میں نے سُنی۔ اس کے کپڑے اتارنے اور غسل کرنے کی آواز مجھے آرہی تھی۔ میں اُٹھا اور مردانے کی بتی گل کر کے آہستہ سے غسل خانہ کی کنڈی کھول کر جھانکا۔ وہ غسل کر چکی تھی۔ اور بدن صاف کرنے میں مشغول تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے بالکل قریب جا پہنچا۔ وہ کپڑے پہننا چاہتی تھی۔ کہ میں نے دھیمی آواز سے کہا "نرملا" اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور سکڑ کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔ ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ اگر ناراض ہو تو چلا جاتا ہوں۔ اس نے مسکرا کر کہا "چلے جاؤ۔ ورنہ بیگم کو بلاتی ہوں" "لو جا رہا ہوں" کہتے ہوئے میں باہر نکل آیا۔

دوسرے دن مجھے فیض نے کہا۔ کہ نرملا کو نکال دو۔ ورنہ ملازمت کے ساتھ عزت بھی خطرہ میں ہے میں نے گھر آ کر نرملا کو باہر مردانے میں بُلایا۔ کہ وہ اپنے گھر لاہور جانا چاہتی ہے تو اسے بھیج دیا جائے۔ وہ تیار ہو گئی۔ میں گھر سے ضروری کام کا بہانہ کر کے نرملا کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گیا۔ راستہ میں میں

نے اس سے سارا حال سچ سچ بیان کرنے کو کہا تو معلوم ہُوا کہ وہ شیخوپُورہ کے ایک امیر ہندو گھرانے کی لڑکی ہے۔ ان کا گھر ہمارے قریب ہی تھا۔ اور میں اس کے خاندان سے خوب واقف تھا۔ وہ گھر سے ناراض ہو کر بھاگ آئی تھی۔ اور اب واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔

لاہور پہنچ کر ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور ہر قسم کے سُنہری مواعید کے بعد میں دس دن تک متواتر اس کے گلشن حسن و جوانی کی خوشہ چینی کرتا رہا۔ گیارھویں دن میں اُسے اُس کی سہیلی کے گھر لے گیا۔ اپنے آپ کو اس کا بھائی ظاہر کیا اور خود نرملا سے اجازت لے کر ایک دن کے لئے شیخوپورہ آیا۔ یہاں پہنچ کر فیض سے معلُوم ہُوا کہ ہندو سبھا والے اس لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہندو سبھا کے ممبر میرے گھر بھی آ دھمکے۔ میں نے قطعی لاعلمی ظاہر کی اور صاف صاف کہہ دیا۔ کہ چند دن وہ لڑکی میرے ہاں رہی لیکن وارث پیدا نہ ہونے کی وجہ سے لڑکی کے کہنے کے مطابق اسے خرچ دے کر لاہور بھیج دیا گیا۔ ان سے پیچھا چھڑانے کے بعد معاملہ خطرناک دیکھ کر میں سیدھا نرملا کے گھر پہنچا۔ لالہ جی (نرملا کے والد) کرُسی پر

بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے انھیں تنہا پا کر میں نے عرض کی۔ "آپ کی لڑکی تو گم نہیں ہوئی"۔

لالہ جی بھونچکے سے ہو گئے اور آخر ہوش سنبھالتے ہوئے بولے "نہیں تو" میں سمجھ گیا۔ کہ بے عزّتی کے خطرہ سے لڑکی سے بیزار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے رازدارانہ طور پر آہستہ سے کہا۔ "لالہ جی! نرملا سے مجھے سب واقعات کا پتہ چل گیا ہے۔ آپ کا چھپانا بے سُود ہے۔ آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔ اور شریف آدمی ہیں۔ ہماری آپ کی عزّت ایک جیسی ہے۔ آپ کی لڑکی میرے گھر میں ہے۔ اور ہر طرح سے محفوظ ہے میں اسے سمجھا بجھا کر آپ کے ہاں پہنچا دیتا ہوں۔ اس طرح عزّت رہ جائے گی۔ اور اگر نرملا ہندو سبھا والوں کے حوالے کر دی گئی۔ تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اور بنی بنائی عزّت خاک میں مل جائے گی"۔

یہ سُنتے ہی لالہ جی گڑگڑا کر کہنے لگے "بھگوان کے لئے کسی سے ذکر نہ کرنا اور اسے جا کر لے آؤ۔ میں نے لالہ جی کو ہر طرح اطمینان دلایا اور خود سیدھا کار کے ذریعہ لاہور پہنچا وہاں سے نرملا کو لیا۔ اور سمجھایا کہ معاملہ بگڑ چکا ہے۔ میں اور

تم تباہ ہو جائیں گے۔ صرف ایک دفعہ تم گھر چلی جاؤ۔ پھر تمہیں لانا میرا ذمہ!!

اس طرح میں نرملا کو لے کر اس کے گھر پہنچا۔ اور اسے والدین کے حوالے کر کے سُکھ کا سانس لیا۔ میرے استفسار پر منظور نے کہا "ہندو سبھا والوں کو لالہ جی نے میری ہدایت کے مطابق کچھ دے دلا کر ٹھنڈا کر دیا" سوا آٹھ بج چکے تھے۔ منظور اٹھا اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہوا۔ کہ اگر آپ ایک دو دن کے لئے شیخوپورہ تشریف لائیں تو ایسی بیسیوں داستانیں سُن لیجئے گا۔

رقابت

میں یہ کیا سُن رہا ہوں صوفیہ! تمہیں خیال ہونا چاہیے کہ اس وقت تم اپنے والد کے ساتھ گفتگو کر رہی ہو۔ کیا تمہیں سکول میں یہی تعلیم دی گئی ہے۔ یہی آداب سکھائے گئے ہیں۔ میں نے سارے خاندان کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہُوئے تمہیں تعلیم دلوائی۔ کیا اس کا یہی حشر ہونا تھا۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے ہمیں واقعی تم سے حد درجہ محبّت ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تم اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھاؤ۔ ہم یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ کہ تم اپنی مرضی سے شوہر کا انتخاب کرتی پھرو۔ جبکہ تمہارے خاندان میں دو نوجوان اس قابل موجود ہیں۔ کہ وہ ہر لحاظ سے تمہارے لئے موزوں ہیں۔ تعلیم دولت۔ عزّت کسی چیز کی کمی میں ان میں نہیں پاتا۔ ہاں یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ سلیم اور حمید دونوں میں سے تم خود کسی ایک کا انتخاب کر لو۔"

صوفیہ: "قبلہ معاف فرمائیے گا۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ یہ قطعی غلط ہے کہ میں سلیم اور حمید کو اہل نہیں سمجھتی۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے ان سے بہتر شریک حیات نہیں مل سکتا۔ پھر ایک ساتھ کے کھیلے ہوئے۔ ایک دوسرے کے عادات۔ اطوار۔ مذاق سے واقف! مجھے ان دونوں سے یکساں طور پر محبت ہے۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہیں پاتی۔ تعلیم۔ دولت۔ عزت میں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے۔ کہ دونوں مجھے جان و دل سے چاہتے ہیں۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہے کہ وہ صوفیہ کو حاصل کرے۔ پھر اس صورت میں جو انجام ہوگا۔ وہ ظاہر ہے۔ اگر میں ایک کو انتخاب کرلوں تو دوسرا آتش رقابت میں کیا کچھ نہ کر گذرے گا۔"

مرزا صاحب! بیٹی یہ سراسر تمہاری غلط فہمی ہے۔ زیادہ فراست بھی انسان کے لئے وبال جان ہو جاتی ہے۔ تم خود بخود ہی یہ باتیں بنا رہی ہو۔ ورنہ وہ تعلیم یافتہ ہیں۔ اتنے بے وقوف ہرگز نہیں۔ وہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ آخر دونوں میں سے ایک ہی کا انتخاب ہوگا۔ یہ مان لیا کہ اس وقت دونوں قسمت آزمائی کر رہے ہیں۔ لیکن انتخاب کے بعد یہ چیز یقینی طور پر ختم ہو جائے گی۔"

صوفیہ! "اباجان یہ محض میرا خیال ہی نہیں۔ بلکہ میرے پاس اس کا کافی ثبوت موجود ہے۔ سلیم اور حمید کی ایسی تحریریں میرے پاس پڑی ہیں۔ جن میں انہوں نے ناکامی کی صورت میں دھمکیاں دی ہیں۔"

مرزا صاحب! ہیں دھمکیاں۔ سلیم اور حمید کی طرف سے لاؤ تو کہاں ہیں وہ خطوط!

صوفیہ نے خط لاکر والد کو دیے۔ اور وہ کھول کر پڑھنے لگا۔

میں آخری تحریر میں اپنا آخری فیصلہ تم پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں اگر تم نے میری محبّت کو ٹھکرایا تو یاد رکھنا۔ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا تم یہ نہ سمجھنا۔ کہ یہ حادثہ بخیریت گذر جائے گا۔ شاید تم ان خوفناک حالات کا تصوّر بھی نہ کرسکو ——— "سلیم"

"خوفناک حالات ———"

پاجی کہیں کا ——— ذرا ماں کو بلاؤ۔ اپنے بھتیجے کا خط سُن لے۔ میں تو اب تک اسے بڑا شریف سمجھ رہا تھا۔

آپ اپنے حمید کا خط بھی پڑھ لیجئے۔ ایسے موقع پر شرافت کام نہیں آتی۔ انسان اندھا بن جاتا ہے۔ دیکھئے تو وہ صاحب کیا لکھتے ہیں"۔

اگر تمہیں سلیم سے پریم ہے۔ اور تمہاری نظر انتخاب اس پر پڑے

تو میں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ میری محبت کو ٹھکرانا آسان نہیں۔ اس کی تمہیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ بہر حال یہ فیصلہ کرتے وقت تمہیں انجام سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اب تمہیں اختیار ہے ——— "حمید"

اچھا "قیمت ادا کرنی پڑے گی"۔ ایسے ایسے قیمت لینے والے ہم نے کئی دیکھے ہیں۔ یہ گیدڑ بھبکیاں ہم کو دی جاتی ہیں۔ صوفیہ۔ سنتی جاؤ ——— تم ناتجربہ کار ہو۔ اتنا بہادر کوئی نہیں اور اگر کسی میں اتنی جرأت ہو بھی تو دیکھا جائے گا"۔

صوفیہ:۔ ابا جان! .... اگر آپ مجھے جہنم میں بھی دھکیل دیں تو مجھے عذر نہ ہوگا۔ لیکن یاد رکھئے گا۔ کہ یہ محض دھمکیاں نہیں ہیں موت سے نہیں ڈرتی۔ مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں۔ لیکن اس طرح سارا خاندان برباد ہو جائے گا۔ آپ مجھ سے بہتر سوچ سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کو اختیار ہے جو چاہیں کریں۔

مرزا صاحب:۔ "پھر اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ تم شادی نہ کرو۔ کیونکہ اگر ان دونوں سے درگزر کسی تیسرے شخص سے بھی تمہارا رشتہ ٹھہرایا گیا۔ تو کیا اس وقت یہ چیز پیدا نہ ہوگی"۔

صوفیہ ——— ہاں ——— ہاں ——— اور وہ اس

لئے کہ اس حالت میں دونوں ناکام ہوں گے۔

مرزا صاحب!" یہ غلط ہے۔ پھر تو ان کو اور زیادہ طیش آنا چاہیے۔ کہ ایک اجنبی ان کا رقیب ہوگا۔ خیر میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ تم یہ بتاؤ۔ کہ تمہیں ان دونوں میں سے کون پسند ہے"؟

صوفیہ! ابّا جان میرے لئے دونوں یکساں ہیں۔ یہ انتخاب مَیں آپ پر چھوڑوں گی۔

مرزا صاحب۔ بیٹی یہ کام میں نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اگر میں نے اپنے بھانجے کو منتخب کیا۔ تو تمہاری والدہ ناراض ہوجائے گی۔ اور اگر سلیم کو پسند کیا تو بھائی خفا! اس صورت میں تم خود ہی اپنی رائے سے پسند کرو۔ اس طرح کوئی بھی متاثر نہیں ہو سکے گا"۔

صوفیہ "نہیں —— نہیں —— ابّا جان مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا"۔

مرزا صاحب! دکچھ سوچ کر) "اچھا تو اس کا فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعہ کیا جائے گا۔

قرعہ سلیم کے نام پڑا۔ شادی رچا دی گئی۔ بظاہر حمید شادی

میں شریک رہا۔ دوران شادی میں اُس نے کوئی حرکت ایسی نہ کی۔ جس سے اُس کی مخاصمت کا احساس بھی پیدا ہو۔ تاہم مرزا صاحب نے اس کی نگرانی کے لئے آدمی مقرر کر رکھے تھے۔ عین اُس وقت جبکہ برات جا رہی تھی۔ حمید نے پستول نکال کر سلیم پر دو فیر کئے۔ سلیم گھوڑے سے نیچے گرا۔ اور زمین پر تڑپنے لگا۔ سب براتی سلیم پر جُھک گئے۔ اور ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ حمید نے عیّاری کا پردہ اٹھایا۔ اور یہ کہتے ہُوئے کہ "شب عروس سے پہلے موت کی ہم آغوشی کے لئے تیار ہو جاؤ۔" صوفیہ کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے پستول کا مُنہ اپنے سینہ پر رکھ کر گھوڑا دبا دیا۔

آن کی آن میں تین نوجوان لاشیں خاک و خون میں لتھڑی فرش زمین پر پڑی تھیں۔

عبرت

نوجوان سپاہی نے زہرہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا! زہرہ! اگرچہ ہماری شادی کو صرف ایک سال کا قلیل عرصہ گذرا ہے۔ اور ہر چند کے یہ جدائی صبر آزما ہے۔ مگر ناگزیر ہے اس وقت دشمنوں نے ہمارے وطن کو محصور کر رکھا ہے۔ اور حبّ وطن کا یہ تقاضہ ہے۔ کہ تم بخوشی مجھے قربانی کے لئے پیش کرو۔"

زہرہ نے اپنی ہچکیوں کو روکتے ہوئے کہا! " خدا حافظ میرے سرتاج! خدا تمہیں فتح و نصرت کے ساتھ مجھ سے ملائے۔ لیکن مجھ دُکھیا کو بھول نہ جانا میرا دُنیا میں تمہارے سوا کوئی سہارا نہیں۔"

زہرہ! میرے ضبط کا امتحان نہ لو۔ سپاہی کے آنسو نہ بہاؤ۔ اگر تمہاری محبت کے صدقہ میں زندہ بچ گیا۔ تو تمہاری پرستش کے سوا میری زندگی کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے"۔

اس مختصر سی پُر ارمان گفتگو کے بعد سپاہی رخصت ہو کر محاذِ جنگ پر پہنچ گیا۔ تیغوں کی جھنکار۔ گولیوں کی بوچھاڑ۔ نیزوں اور بھالوں کی سنسناہٹ دشمن کے خوف اور فتح و شکست کی اُمید و بیم میں اسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ہاں! کبھی کبھی .... زہرو کی جمیل مسکراہٹ کا حسین تصوّر۔ اس کی مرمریں۔ آغوش اور ہنگامِ رخصت "خاموش آنسو" اسے ایک ملکوتی دنیا میں پہنچا دیتے تھے۔ زہرہ کی حالت زار کا نقشہ اس کی آنکھوں میں کھچ جاتا۔ اور وہ کانپ اُٹھتا۔ لیکن پھر اپنے فرائض کے احساس اور جوشِ مردانگی کے خیال سے پکار اٹھتا۔ نہیں۔ نہیں میں آخر دم تک دشمن کا مقابلہ کروں گا۔ میں اپنے وطن عزیز کی حفاظت کے لئے جان لڑا دوں گا۔

گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔ تلواروں کی کڑک اور بندوقوں کی گرج سے کان پھٹے پڑتے تھے۔ انور سپاہی بھی نہایت مستعدی اور انہماک سے دشمنوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اپنی خونریز شمشیر سے کئی حریفوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ کہ یکایک سنسناتی ہوئی گولی اس کے پہلو کو چھیدتی ہوئی گذر گئی۔ وہ زخمی ہو کر گرا اور بیہوش ہو گیا۔

اختتام پر لڑائی مخالفوں کے ہاتھ رہی۔ ہزاروں قیدی اور لاکھوں روپے کا سامان جنگ غنیم کے قبضہ میں آیا۔ انور بھی زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ وہ قیدی ہسپتال میں پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی حالت نازک تھی۔ مس زبیدہ اُس کی مرہم پٹی کے لئے مقرر تھی۔ انور کی خوبصورت جوانی کو دیکھ کر زبیدہ اس کا علاج نہایت تندہی سے کر رہی تھی۔ اس رات وہ بہت بے چین تھا۔ زبیدہ نے ساری رات جاگتے گذار دی۔ انور نے کئی دفعہ اِسے آرام کرنے کے لئے کہا۔ لیکن وہ نہ مانی۔ دوسرے دن اتوار کو کچھ افاقہ تھا۔ اس کی حالت اُمید افزا ہو رہی تھی۔ زبیدہ کا چہرہ شگفتہ پھول کی طرح کھلا ہُوا تھا۔ اور وہ ایک خاص قسم کی مسرّت محسوس کر رہی تھی۔ انور نے آہستہ سے زبیدہ سے کہا۔ آپ کی ہمدردی اور زحمت کا شکریہ!

(زبیدہ نے لجاتے ہُوئے کہا) اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے یہ تو میرا انسانی فرض ہے۔

کیا آپ مہربانی فرما کر مجھے بتائیں گی کہ اس وقت میں کہاں ہوں اور لڑائی کی کیا صورت ہے۔

لڑائی ہمارے ہاتھ رہی ہے۔ اور آپ زخمی ہو کر گرفتار ہو چکے

ہیں۔

میں اسیر ہوں۔ تو محترمہ مجھ سے کسی قسم کی ہمدردی کرتے ہُوئے آپ اپنی پوزیشن کا خیال رکھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ دشمنوں کے وقار کو ٹھیس پہنچے۔

میں ان لغو باتوں کی پرواہ نہیں کیا کرتی۔ میں ہر وقت آپ کی ہر قسم کی خدمت اور مدد کے لئے حاضر ہوں۔ بشرطیکہ آپ وطنیت سے دور رہیں۔

آپ کا شکریہ! میں ہر طرح آرام سے ہوں۔ مجھے اتنا سکون آج تک میسّر نہیں ہو سکا۔

اس رومانوی صحبت کے بعد زبیدہ کسی کام کے لئے چلی گئی اور انور اس کے مخلصانہ التفات میں اپنی خوش بختی کے خواب دیکھنے لگا۔ وہ زبیدہ پر بے طرح مفتون ہو چکا تھا۔ وہ اس کے بے پناہ حسن و جمال کا تہ دل سے گرویدہ ہو چکا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ زبیدہ کو اپنے جال میں پھنسانا شروع کیا۔ اور آخر کار وہ خلط ملط ہو کر رہ گئے۔

انور نے صحت یاب ہوتے ہی زبیدہ سے عقد پڑھا لیا۔ وہ نہایت عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے لگا۔ اور معصوم زہرہ کی بے لوث محبت

کو یک قلم بھول گیا۔

زہرہ کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ اُس کی رعنائی حسن ماند پڑ گئی اور اُس کی صحت قائم نہ رہی۔ انور کے انتظار میں اُس کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ مگر وہ نہ آیا۔

لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ مصالحت کے بعد قیدی رہا کر دیئے گئے تھے۔ ہر ایک سپاہی خوشی خوشی اپنے گھر واپس آ گیا۔ لیکن انور کا کوئی پتہ نہ تھا۔ زہرہ نے بہت تحقیق کی۔ لیکن سب نے اس کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا۔

اس لئے اب اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ انور کی شہادت کا اعتبار کرے۔ اور اپنی آئندہ زندگی کے لئے پروگرام سوچے۔ لیکن وفا کیش زہرہ اپنے شوہر کی یاد میں اپنی عمر وقف کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

شاہد انور کا عمزاد بھائی تھا۔ اس نے زہرہ کے حصول کے لئے بہت کوشش کی تھی۔ لیکن انور کے مقابل اسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

شاہد کے کانوں میں جب زہرہ کی اس حالت زار کی بھنک پڑی تو اُس نے اُس کے ہاں رسم و راہ شروع کی۔ اور اسے ہر طرح الوز

کی موت کا یقین دلا کر اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کی۔ زہرہ ہر چند انکار کرتی رہی۔ لیکن وہ آخر جوان تھی۔ صرف ایکسال بیاہ کو نہ گزرا کہ یہ افتاد آن پڑی۔ شاہد کی ہر وقت کی انگیخت سے وہ بھی کچھ کچھ رضامند ہو گئی۔

انور کو گئے چار سال گذر چکے تھے۔ اس نے شاہد سے وعدہ کر لیا کہ وہ ایک سال تک مزید اس کا انتظار کرے گی۔ اور اگر اس عرصہ میں وہ نہ آیا تو وہ عقد کر لے گی۔

ایک سال بھی ختم ہو گیا۔ اور انور نے نہ آنا تھا نہ آیا۔ زہرہ نے ایک مہینے کی اور معیاد لے لی کہ شاید وہ آجائے مگر بے سود!

آخر وہ تاریخ آن پہنچی۔ جس دن زہرہ شاہد سے منسلک ہونے والی تھی۔

انور کا رومان ابھی تازہ ہی تھا۔ کہ یکایک باد حوادث کے تند جھونکوں نے اس کے گلشن طرب کو تاراج کر دیا۔ اور زبیدہ ایک مہلک مرض کا شکار ہو کر اسے داغ مفارقت دے گئی۔

اس حادثہ کے بعد جب انور کی اس خواب خرگوش سے آنکھ کھلی تو اُسے زہرہ کا پیمان وفا یاد آیا۔ اور وہ وطن لوٹا۔

عقد پڑھایا جا رہا تھا۔ گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ اور در و دیوار

پر کیف و سرور برس رہا تھا۔ کہ یکایک مکان کا پھاٹک کھُلا۔ اور
انور داخل ہُوا۔ اسے دیکھتے ہی سب کے رنگ فق ہو گئے۔ زہرہ
زرد پڑ گئی۔ اُس کی آنکھیں جھُک گئیں۔ وُہ اُٹھی اور حالتِ انفعال
میں دو منزلوں سے گر کر خودکشی کر لی۔

لغزش شباب

موضع گجراں میں آئے مجھے آج دُوسرا دن تھا۔ میرے لئے دیہاتی فضا سے متعارف ہونے کا اپنی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ ہاشمی کے "ڈنگروں کا کوٹھا" "بھیڑوں کا گلہ" نتھو بڑھئی، کلّن شیر فروش، لالو بنئے کی دوکانوں کے علاوہ لہلہاتے کھیتوں کی ویران وسعت بھی ایک ہی سانس میں دیکھ چکا تھا۔ اور اب تک میں یہ سمجھنے کی کوشش میں تھا۔ دیہاتی زندگی کا وہ کون سا جاذب پہلو ہے۔ جس سے ہاشمی جیسے مغرب زدہ گریجوایٹ کی تسکین ہو رہی ہے۔

میں بڑے اصرار سے اور اشتیاق سے بُلایا گیا تھا۔ اور یہاں مجھے کم از کم مہینہ بھر قیام کرنا ناگزیر تھا۔ پہلے ہی دن کے سرسری مطالعہ کے بعد میں نے ان ویرانوں میں مزید بادیہ پیمائی کی زحمت گوارا نہ کی۔ مردانے میں میرے سلئے خاص اہتمام سے

جگہ سجائی گئی تھی۔ اور اس میں ہر ممکن بہم شدہ تکلف سے کام لیا گیا تھا۔ ہاشمی کی لائبریری جو ایک بیش بہا ذخائر کتب پر مشتمل تھی۔ میرے ایک مہینہ گزارنے کے لئے بہترین مشغلہ تھا۔ لیکن ہاشمی کی ذات سے مجھے کچھ اتنا قریبی تعلق اور حقیقی اُنس تھا۔ کہ اس کی موجودگی میں مجھے دُنیا کی کوئی دوسری دلچسپی گوارا ہی نہ تھی۔

دن کا پہلا نصف حصّہ ہاشمی کھیتوں پر گذارتا اور یہ وقت مجھے مطالعہ کے لئے مِل جاتا تھا۔ اس کے بعد دن کا باقی حِصّہ اور رات کا اکثر وقت ہمارے ادبی سیاسی اور رومانوی بحث و تذکرے میں صرف ہوتا۔

ہاشمی کے ملازموں کے علاوہ اس کی ایک خادمہ جنت میری پذیرائی میں خاص طور سے سرگرم نظر آتی تھی۔ شروع شروع میں تو میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن زیادہ قریبی مشاہدہ سے اس کے والہانہ انداز اور الہڑ اداؤں میں مجھے کچھ کچھ جاذبیت نظر آنے لگی۔

دیہات کے بے ربط ناموں میں جس طرح جنت کا نام شاعرانہ تھا۔ اسی طرح اور بعینہٖ دیہاتی بے جوڑ حسن میں اُس کی شکل و صورت

بھی قابل قبول تھی۔ لیکن اس پر بے پناہ شباب کی کارفرمائی نے وہ محشر برپا کر رکھا تھا۔ کہ اسے نظر انداز کر دینا کسی اہل دل کے بس کی بات نہ تھی۔

مجھ شہری حسن کے دلدادہ کو تو اس نے کیا اپیل کرنا تھا۔ ہاں ایک دفع الوقتی اور دل لگی کے طور پر میں نے جنت کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ مجھے یہ دیکھ کر سخت اذیت محسوس ہونے لگی کہ وہ معصوم میرے اس تصنع آمیز رویہ کو حقیقت سمجھ کر مجھ پر پروانہ وار اپنی جان چھڑکنے لگی۔ میں اب اس کی غلط فہمی دُور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی دل شکنی کا خیال اس تلخ حقیقت کے اظہار سے مانع رہا۔ وہ مجھ سے روز بروز زیادہ کھلتی گئی۔ اور ہاشمی کی عدم موجودگی میں ہم راز و نیاز سے گزر کر رومانِ محبّت کے دلفریب حصاروں کو توڑتے ہوئے اپنی آتش ہوس بجھانے لگے۔

سادہ دل جنت اس خواب فردوس کی مکروہ تعبیر سے بے خبر تھی اور میں نفس پرستی کے نشے میں اندھا! اس کو سب سے پہلے اس وقت اس کا احساس ہُوا۔ جب اس نے سُنا کہ میں کل جا رہا ہوں وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کی ہچکی بندھ چکی تھی۔ میں نے اُسے ہرچند دلاسا دیا۔ لیکن اس کی بیقراری بڑھتی گئی۔

بڑی مشکل سے اُس نے یہ الفاظ ادا کئے۔

"آپ جا رہے ہیں۔ تو مجھے بھی ساتھ لے جائیے۔ اب میں یہاں رہ کر کیا کروں گی"۔

"چلو جنّت .... میں اس کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اس طرح یہ لوگ شک کرنے لگیں گے۔ اگر ذرا صبر سے کام لو تو میں کوئی ذریعہ بنا کر دوبارہ عنقریب آؤں گا۔ اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گا"۔

"میں تمہارے بن یہاں کیسے جیؤں گی"۔

"گھبراؤ نہیں جنّت! جلدی نہیں کرنی چاہیئے"۔

ہاشمی کے پاؤں کی آہٹ سے ہماری گفتگو بے نتیجہ رہ گئی۔ دوسرے دن صبح میری روانگی تھی۔ اس نے کئی بار مجھے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن میں کتراتا رہا۔

آخر میری روانگی کا دن آن پہنچا۔ یوں تو میری جدائی ہاشمی کو بھی شاق گذر رہی تھی۔ لیکن جنّت کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ کھوئی کھوئی ہوئی سی تھی۔ اور اس کی حرکتیں مجنونانہ تھیں۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اور آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ بس اب وہ رویا ہی چاہتی ہے۔

ہم سٹیشن پر پہنچے۔ ہاشمی سے بغلگیر ہونے کے بعد میں جنّت کو الوداع کہتے ہوئے ٹرین میں سوار ہو گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی ہم ایک دوسرے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جدا ہو رہے تھے۔ ابھی جنّت آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائی تھی کہ میں نے دیکھا وہ آنکھوں پہ دوپٹہ رکھ کر روتے ہوئے گھر کو لوٹی۔ میں اپنی بدکرداری اور جنّت کے حسرت ناک انجام کے بھیانک تصور میں کھو گیا۔

گجرات سے آئے ہوئے کچھ عرصہ گذر گیا۔ ہاشمی سے خط و کتابت جاری تھی۔ لیکن اس نے کبھی جنّت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ لکھا۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں ایک دفعہ اس نے لکھا کہ جنّت بیمار ہے اس کے بعد ہاشمی کا سخت وحشت افزا خط ملا۔ جس میں یہ لکھا تھا کہ جنّت کو اچانک حمل کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ ہمارے لئے سخت بدنامی کا باعث تھا۔ اس کمبخت سے بہتیرا ڈرا دھمکا کر پوچھا لیکن اس نے نہ بتایا۔ آخر اسے واجب الادا تنخواہ دے کر ملازمت سے برطرف کر دیا۔"

اس منحوس خبر سے میں لرزنے لگا۔ خط میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ میرے دماغ میں نشتر چبھنے لگے۔ اور اپنی حیوانیت کا نقشہ میری آنکھوں میں کھچ گیا۔ یکایک دروازے کی کنڈی کھٹکی میں برآمدے میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نیچے جھانک کر دیکھا۔ تو جنّت کو کھڑا پایا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

اُف خُدا ..... اب کیا کروں۔ میں جلدی سے نیچے اُترا۔ جنت کو اندر بلا کر مردانے میں بٹھایا۔ اور لجاجت سے کہا۔

"خدا کے لئے جنت! میرے ناموس پر پانی نہ پھیرو۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میری بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی"۔

"تمہاری عزت" اس نے استہزا آمیز لہجہ میں کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری عزت خاک میں نہیں ملاؤں گی۔ میں صرف ایک بار تمہیں دیکھنے کے لئے آئی ہوں اور ابھی جا رہی ہوں"۔

"کہاں جاؤ گی جنت"! میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

اس کے متعلق تمہیں پوچھنے کا کوئی حق نہیں بس مجھے جانے دو"۔

ابا کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ میں نے جلدی سے اسے رخصت کر کے خدا کا شکر ادا کیا کہ سر سے بلا ٹلی۔ اس رات مجھے بالکل نیند نہ آئی۔ شب بھر میں اس ہولناک تصور میں کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے دن میں دفتر جا رہا تھا۔ کہ راستہ میں ایک جنازہ ملا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک عورت $\frac{1}{2}$ ۹ بجے کی ٹرین کے نیچے کٹ مری ہے میں جنازہ کے ساتھ ساتھ ہسپتال پہنچا اور وہاں پہنچ کر شکل کی شناخت کی آہ ..... وہ معصوم جنت کی لاش تھی۔

خطوط

خطوط کے ذیل میں ان معاشرتی نقائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن کا افسانوں میں سمانا دشوار تھا۔

ان میں مرد کے تفوق بیجا، کثرت تولید کے نقصانات اور عورت کی تعلیم و آزادی کے فوائد پوری وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

ان کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ یہ کوئی زائد چیز نہیں۔ بلکہ شاید ان کے بغیر یہ تصنیف نامکمل اور تشنہ رہ جاتی!!!

پہلا خط

تم بھی عورت کے جذبات سے کھیلنا چاہتے ہو۔ گریجوایٹ اور آزاد منش ہوئے تو کیا آخر تمہیں بھی مرد ہونے کا کچھ تو ثبوت دینا چاہیے۔ ذرا پھر کہنا تو "دوسری شادی کرنے میں کیا قباحت ہے"۔ واقعی کوئی قباحت نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اسے بھی اس کی اجازت دو۔ اور اپنے موجودہ تعلقات قائم رکھتے ہوئے! کیوں۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو تو ...... دھڑکن کا کیا اندازہ ہے؟ تم تو شاید مرنے کے بعد بھی اس کی یہ حرکت گوارا نہ کرو گے پھر اپنے لئے قباحت نہ سمجھنا انتہائی بے حمیتی نہیں تو کیا ہے؟

عوام کی اس ذلیل ذہنیت سے تو میں خیر جلتا ہی رہتا ہوں لیکن واللہ آج تمہاری اس تحریر سے تو مجھے سخت روحانی اذیت پہنچی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تم لوگ آخر عورت پر اتنا

تفوق کس بات میں سمجھتے ہو۔ کیا وہ تمہارے دوش بدوش دُنیا کے حوادث میں حصّہ نہیں لیتی؟ کیا دُنیاوی و خانگی معاملات میں وُہ تمہارا ہاتھ نہیں بٹاتی؟ اور کیا وہ اولاد کی تربیت میں تم سے کم سرگرم رہتی ہے؟ شاید تمہیں یہ زعم ہو کہ تم کماؤ ہو اتم تمدن و معاشرت کے ٹھیکیدار ہو اور تم ضروریات زندگی کے حصول کا ذریعہ ہو۔ تو یہ کہتے ہُوئے تمہیں کچھ شرم آنی چاہیئے۔ ذرا گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھنا چاہیئے۔ کہ عورت کی اس کمزوری کا باعث کون ہے۔ اسے تعلیم سے عاری اور پردہ کا پابند، اُسے شرم وحیا کا مجسمہ اور اپنی خواہشات کا آلۂ کار بنا کر ان خوبیوں سے بے بہرہ رکھنے والا کون ہے۔ تمہاری خودغرضانہ پالیسی نے تو اسے اُبھرنے نہ دیا۔ اور پھر اس پر یہ اتہام! یورپ میں جاکر دیکھو جہاں عورت کے حقوق پہچانے جاتے ہیں۔ جہاں اُسے ہر طرح آزادی میسّر ہے۔ وہاں وہ کس بات میں مرد سے پیچھے ہے۔

تم عورت سے کیا گلہ کرتے ہو۔ غلامی ایسی لعنت ہے جس سے مرد نکمے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو اپنے ہی ملک کو دیکھو۔ صرف سو سال کی غلامی نے تمہارے تخیل میں کیا انقلاب برپا کر دیا ہے۔ سوائے غلامانہ زندگی کے دماغ

میں دوسرا تصور ہی عنقا ہے۔ اب تمہیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ کبھی تمہاری کشور کشائی بھی ضرب المثل تھی۔ اور کبھی تمہارے زور بازو کے بھی دُنیا میں چرچے تھے۔ پھر عورت بیچاری کا کیا قصور! وہ تو صدیوں سے غلام در غلام چلی آتی ہے۔ اس کی تو دُنیا ہی تم نے گھر کی چار دیواری تک محدود کر دی اور اب اس کی زندگی بھی محدود کرنے کے درپے ہو۔ تم کہتے ہو "ایک عورت پر زندگی بھر قناعت کرنا مشکل ہے۔" کاش کہ اس کا دوسرا پہلو بھی سوچا ہوتا۔ انصاف تو یہ ہے۔ کہ وہ بھی انسان ہے اس کے لئے بھی زندگی بھر ایک ہی مرد پر قناعت کرنا ظلم ہے کہو کیا خیال ہے۔ آپ بولتے کیوں نہیں۔ سانپ کیوں سُونگھ گیا۔ گویا کہ صرف تمہارے ہی ساتھ نفس ہے۔ محض تم ہی خواہشات رکھتے ہو! تمہارا ہی انوکھا دل ہے۔ اور وہ .... وہ تو ایک آلہ ہے ..... ہوسرانی کا .... ایک ذریعہ ہے۔ تمہارے تعیش کا اور بس ....

میں مرد ہوں اور مرد کی فطرت سے بخوبی واقف۔ مجھ سے پوچھو اپنی طبینت کا حال۔ آج تم ایک عورت پر قناعت

کرنا مشکل سمجھتے ہو۔ کل جب تمہارے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ اور تمہارا بس چلے گا۔ تو تم شاید علانیہ طور پر یہ کہو گے کہ مرد کا ہر خواب نشاط ایک حسین دوشیزہ کے ساتھ شرمندۂ تعبیر ہونا چاہیے۔ ورنہ عورت کا مصرف ہی کیا ہے؟ دراصل جب انسان احساسات کھو بیٹھے تو پھر اس کے لئے یہ دُنیاوی اصطلاحیں لایعنی بن کر رہ جاتی ہیں۔

دُوسرا خط

اسلام چار نکاح کی اجازت دیتا ہے! ٹھیک ہے! لیکن اسے حصول مطلب کے لئے مذہب، رواج اور سماج کو ذریعہ بنانے والے نفس پرست انسان! یہ نہ سوچا کہ یہ اجازت کس صُورت میں ہے اور آیا تم اس کی استطاعت رکھتے ہو یا نہیں

سُنو! تمہارے فرمانروا جب نشۂ سلطنت سے بہکنے لگے تو انہوں نے اپنی تسکین کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کیا۔ عورت کی عصمت و عفت کی کوئی قدر و قیمت نہ رہی زرد مال کے پجاری مرد بادشاہ سلامت کی دلداری کے لئے اپنی بہو بیٹیوں کو بھینٹ چڑھانے لگے۔ معصیت کا دور دورہ ہُوا۔ اور یہ مرض اتنا بڑھا کہ بادشاہ تو کیا سب امراء اور ہر قبیلے کا سردار سارے قبیلے کا غارت گر عصمت ہُوا۔ غریب اور کم مایہ لوگ نان و نفقہ کا سہارا نہ پا کر اس ذلت کو گوارا کرنے

لگے۔

اسلام کے ظہور پذیر ہونے پر جہاں اور برائیوں کا انسداد کیا گیا۔ وہاں اس لعنت کو دُور کرنے کے لئے بھی یہ حکم ہوا کہ صاحب استطاعت شخص زیادہ سے زیادہ چار نکاح کر سکتا ہے۔ اس قانون ایزدی کا روشن پہلو یہ تھا کہ زناکاری کی مروّجہ لعنت کو مٹایا جائے۔ اور ہوسرانوں کی تسکین نفسی کے لئے اس قدر رعایت رکھی گئی۔ تاکہ رفتہ رفتہ ان کی اصلاح ہو سکے لیکن اس کے ساتھ ہی عورت کے حقوق کا بھی سختی کے ساتھ اعلان کیا گیا۔

تم جیسے نفس پرست انسان اس قانون سے استفادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں کرو۔ لیکن ذرا اپنی بضاعت کا جائزہ لے لو کہ تم کہاں تک اس کے متحمل ہو سکتے ہو۔ فی زمانہ چالیس روپے کی کلرکی پہلے ہی جس قدر تنگی سے تمہارا گزارہ چل رہا ہے۔ تمہارے خطوط اس کے شاہد ہیں۔ جن میں تم اکثر رونا رویا کرتے ہو۔ اس پہ طرہ یہ کہ دو بچوں کے باپ ہو۔ جس کے بعد میرے نزدیک تو تمہاری عمر طبعی ختم ہو چکی ہے۔ اب تمہاری ذمہ داری کا یہ تقاضا ہے کہ آئندہ کے لئے بچہ کشی سے توبہ

کرو۔ اور باقی عمر بچّوں کی تعلیم و تربیّت کے کفیل بنے رہو۔ لیکن تم ہو۔ کہ نئے سر سے جوان بنے جا رہے ہو۔ دوسری شادی کے خواب دیکھ رہے ہو۔ اور اپنی سابقہ لغزشوں کو فراموش کر کے پھر سے رومانی زندگی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو۔

یہ تو تمہارے ظاہری ارادے ہیں۔ دلی مدعا تو شاید یہ ہو کہ ان علتوں سے دامن بچا کر کہیں نکل جاؤں۔ ان زنجیروں کو توڑ کر کہیں بھاگ جاؤں۔ تمہاری تو یہ حالت ہے جو آزاد فضا میں سانس لے رہے ہو۔ بچّوں کی تربیت کی الجھنوں سے دور ہو اور ان کی خبر گیری کے تردد سے بے نیاز — پھر ذرا اس ہستی کی کیفیّت کا تصوّر کرو جو رات دن ان سے وابستہ ہے۔ جس کی رات کی نیند حرام تو دن کا چین مفقود ہے۔ جو اپنے خون جگر سے ان کی پرورش کر رہی ہے کیا بچہ کشی پر زور دیتے ہوئے جب تمہیں مخلوق خدا اور اُمت رسُول کے افراط کی فکر دامنگیر تھی۔ کبھی تم نے موجودہ صورت کا تصوّر بھی کیا۔ تمہاری لاعلمی کو تو میں تسلیم کرنے سے رہا۔ جبکہ میں نے خود اس وقت بار بار اس کا اعادہ کر کے تمہاری توجہ اس طرف مبذول کرائی — اور تمہیں کہا کہ اپنی تو کیا اس معصوم ہستی کی زندگی اجیرن نہ کرو۔

جس کا دامن شومئ قسمت سے تمہارے ساتھ گانٹھ دیا گیا ہے لیکن تم تو اُس وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ میری باتوں میں کہاں آتے تھے۔ تمہیں تو دنیا پر اپنی قوت مردمی کا اظہار مقصود تھا۔ تمہارے کان میں تو یہ پھونکا گیا تھا۔ کہ پہلے سال کا خطا چلا جانا تمہاری کمزوری کی دلیل ہوگی۔ تم لوگ کتنے کم ظرف ہو اور کس قدر تلوّن مزاج واقع ہوئے ہو۔ تمہیں یاد ہوگا۔ کہ جب شادی کے بعد تم نے اپنا پروگرام یک سر بدل دیا۔ تو میں نے اعتراض کیا تھا۔ کہ یہ کیا حماقت ہے۔ اس پر تم نے کیا بھونڈے وجوہات پیش کئے تھے۔ میں نے اسی وقت کہہ دیا تھا۔ کہ تمہاری یہ عورت پرستی محض چند دنوں کی ہے۔ یہ اس وقت تک کے لیئے جب تک اُس پہ رعنائی و جمال کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اور جتنی گرمجوشی سے تم اس کا خیر مقدم کر رہے ہو۔ ایک دن اتنی ہی سرد مہری سے اسے ٹھکراؤ گے۔

بتاؤ۔ اب تمہارے وہ دعاوی کیا ہُوئے۔ بلقیس کو اب کونسے کیڑے پڑ گئے ہیں۔ سارے اڑھائی سال ہی تو ہُوئے ہیں۔ تمہاری شادی کو! اس مختصر عرصہ میں وہ کونسی کہنہ عمر ہو گئی ہے

ہاں اگر حسن وجمال اور شباب و رعنائی میں کچھ کمی آ گئی ہو تو وہ بھی تمہاری گلچینی اور بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے۔ پھر اس سے سرد مہری اور تغافل برتنے کی بجائے اپنے آپ کو کوسو، اپنی ہوسرانی کا ماتم کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہارے قوائے میں بھی تو اضمحلال واقع ہوا۔ اور تمہارے شباب میں بھی تو پہلا سا تناؤ نہیں رہا۔ پھر اگر وہ تمہاری ان کمزوریوں کو برداشت کر رہی ہے۔ تو تم کیوں نہ کرو۔ جو خود تمہارے ہی کرم کا نتیجہ ہیں۔ لیکن تم تو کسی نئی دلچسپی کی تلاش میں ہو۔ ایک زندگی غارت کرنے کے بعد کسی دوسری ہستی کو تباہ کرنے کی فکر میں ہو۔ اپنی عیاش طبع کی تسکین چاہتے ہو۔ لیکن غلامانہ زندگی کے باعث تمہارا ذہن اتنا محدود اور تمہارا تخیل اس قدر پست ہو چکا ہے۔ کہ تم نے "عیاشی" کا مفہوم فقط زناکاری ہی سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی عیاشی نہیں۔ تم تباہی کے غار میں چھلانگ لگانے کو عیاشی کہتے ہو۔ تم موت کی آغوش میں چلے جانے کو عیاشی جانتے ہو۔ اور تم اپنا سرمایہ ہستی لٹا دینے کو عیاشی سمجھ رہے ہو۔ حالانکہ درحقیقت عیاشی اس قہقہے کا نام نہیں جس کے بعد دائمی گریہ ہو۔ عیاشی اس روشنی کو نہیں کہتے جس کے بعد ہمیشہ کے لئے

بھیانک تیرگی چھا جائے اور عیاشی اس بہار کو نہیں کہا جاتا جس کے بعد جاودانی خزاں کا تسلط ہو جائے۔

تعلیم حاصل کی ہے تو اس سے کچھ کام بھی لیا ہوتا۔ لکیر کے فقیر بنے رہنا اور خدا داد ذہن و فراست سے کام نہ لینا پرلے درجہ کی جہالت ہے۔ جہلا کی اصطلاح میں عیاشی دنیاوی کاموں کے کسی شعبہ میں حد اعتدال سے گذر جانے کا نام ہے لیکن اس میں کچھ تنوع کچھ جدّت پیدا کرنی چاہیے تھی۔ اہل مغرب کو دیکھو۔ بقائے حیات کی فکر میں ہیں۔ تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ بقائے عیاشی کی جستجو کرتے۔

آؤ میں تمہیں بقائے عیاشی کا فلسفہ بتاؤں۔ ہر کام میں اعتدال پسندی سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے۔ خدا نے تمہیں جو دولت ودیعت کی ہے۔ اگر تم اسے ایک ہی سانس میں اڑا کر عمر بھر کے لئے بھیک مانگتے پھرو۔ تو اچھا ہے یا اسے اعتدال سے صرفہ میں لا کر ساری عمر کسی کا دست نگر نہ ہونا؟

اگر غور کرو تو در اصل حقیقی عیاشی یہ ہے کہ انسان نشۂ شباب سے بہک کر گرنے کی بجائے سنبھل کر چلے اور اپنی تمام عمر آسودہ گذارے ابھی تمہارے عہد جنوں کے کچھ دن باقی ہیں۔ اور اس

لئے دوسری اور تیسری شادی کی امنگیں تمہارے دل میں کروٹیں لے رہی ہیں۔ جب یہ خمار اُترے گا۔ جب یہ طلسم ٹوٹے گا۔ جب ذرا ہوش میں آؤ گے تو عمر کا وہ تلخ حصّہ جسے بڑھاپا کہتے ہیں۔ آنسوؤں میں گذارو گے۔ چالیس تک پہنچتے پہنچتے یہ حشر ہو گا کہ بال سفید۔ آنکھوں میں تیرگی۔ سماعت مفقود۔ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ کمر ٹیڑھی۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ۔ کسی دن چلتے پھرتے دم ہوا ہو جائے گا۔ تین بیوہ عورتیں رانڈ ہو کر در در رُلیں گی۔ اور کئی بچے یتیم بن کر فاقہ کشی کے عالم میں تمہاری جان کو روئیں گے۔ یہ ہے۔ انجام تمہارے ناپاک تخیل کا۔ اب تمہیں اختیار ہے کہ تین شادیاں کرو یا چار — البتہ چار کرنے میں کچھ بہتری کی صورت ہے اور وُہ یوں کہ چالیس پچاس تک ایڑیاں رگڑنے کی زحمت نہیں برداشت کرنی پڑتی بلکہ تیس سے ادھر ہوتے ہی سال چھ ماہ میں کسی دن راہ چلتے ٹھوکر کھا کر گرے اور حرکت قلب بند ہو کر ڈراپ سین ہو گیا۔

میری اس نمک پاش تحریر سے تمہارا سیخ پا ہونا تو یقینی ہے لیکن کیا کروں۔ میرے پاس بے حس افراد کے لئے سوائے نشتر زنی کے دوسرا علاج نہیں۔

کل اخبار میں ایک خبر نظر سے گذری کہ میو ہسپتال لاہور میں ایک سکھ عورت نے چھت سے گر کر خودکشی کر لی۔ خودکشی کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے خاوند نے اسے لاعلاج سمجھتے ہوئے دوسری شادی کر لی تھی۔

دیکھا تم نے یہ انتہائی ہوس پرستی نہیں تو کیا ہے؟ ایک دن وہی سردار صاحب کس شوق سے اُسے بیاہ کر لائے ہوں گے۔ اس کے ساتھ کیا کچھ پیمان اور مواعید ہوئے ہوں گے۔ پھر اس کے شباب وحسن سے نہ جانے کتنے عرصہ تک اپنی وحشت کی تسکین کرتے رہے، لیکن اس کے بیمار ہوتے ہی اپنی آتش نفس بجھانے میں ذرا سی تاخیر گوارا نہ کرتے ہوئے فوراً دوسری شادی کر لی۔

مرد کی بے حمیتی کا یہ انتہائی شرمناک واقعہ ہے۔ کوئی اپنے پالتو کتے کے ساتھ بھی تو ایسا ذلیل سلوک نہیں کرتا۔ لیکن اس پر ہمیں خوش نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ایسے سلوک سے عورت کی غیرت کو چیلنج کر رہے ہیں۔ اگر ایک دن وہ تنگ آ کر مرد کے مقابل اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے جوابی کاروائی شروع کر دی تو شاید ہماری زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ مرد کے لئے خودکشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ وہ اپنی عاقبت نااندیشی پر کف افسوس ملے گا۔ لیکن اس وقت کی ندامت قطعی بے سود ہو گی۔ کیونکہ پانی سر سے گزر چکا ہوگا!

تیسرا خط

لو آج تمہیں ایک نئی خبر سناؤں۔ آج ایک مسلمان لڑکی نے شوہر کی وحشت کاریوں سے تنگ آکر اور مذہبی و شرعی طور پر مخلصی کی کوئی سبیل نہ پاتے ہوئے عیسائی مذہب کی آغوش میں پناہ لی۔

یہ لڑکی ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ سلیمہ نام ہے اور نہایت حسین و جمیل مگر غریب لڑکی ہے۔ اس کے والد نے مال و زر کے لالچ میں ایک بھیڑیا صفت شخص سے اُس کی شادی کر دی۔ شروع شروع میں تو میاں صاحب کا عشق تازہ تھا۔ تعلقات خوشگوار رہے۔ اور وہ دو سال تک سلیمہ سے مانوس رہا۔ لیکن آخر اس کا جذبۂ محبت سرد ہوا۔ تو اس نے دوسری شادی کر لی۔ اور سلیمہ سے اس قدر بے اعتنائی برتنی شروع کی کہ راہ و رسم تک کر دی۔

سلیمہ ایک سال تک اپنے معصوم بچے کو ساتھ لئے والدین کے ہاں بیٹھ رہی۔ آخر اس کے والد نے عقیل کو بُلا کر بُرا بھلا کہا اور اسے مجبور کیا کہ وہ سلیمہ کو طلاق دیدے۔ لیکن عقیل نے ایک نہ سُنی۔ خوب جرگے معرکے ہُوئے۔ شرعی فیصلے طلب کئے گئے۔ لیکن سب نے سلیمہ کو عقیل کی ملکیت بتایا۔ اور اس کی رہائی کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا۔

حتےٰ کہ عدالتی چارہ جوئی میں بھی انہیں ناکامی ہوئی۔ تب سلیمہ نے وکیل کے مشورہ سے عیسائی مذہب قبول کر کے اس مصیبت سے چھٹکارا پایا۔

یہ ہے وہ المناک واقعہ جس نے آج میرے جذبات میں ایک انقلاب برپا کر رکھا ہے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو مذہب مساوات کا علمبردار تھا۔ جس مذہب نے دُنیا کو اخوت کا درس دیا۔ جس مذہب نے عورت کے حقوق اور آزادی کا سب سے پہلے اعلان کیا۔ آج اس کے ناخلف پیروؤں نے اپنی خود غرضی اور مطلب برآری کے لئے اس کا غلط استعمال کر کے اسے دُنیا میں بدنام و رسوا کر دیا۔ آج اس کے وسیع و عالمگیر دائرے

کو اتنا تنگ و محدود کر دیا گیا ہے ۔ کہ اس میں آزادی کا سانس تک لینا دشوار ہے ۔ آج اسے اتنا الجھا دیا گیا ہے کہ اسے سمجھنا مشکل ہے ۔ آج اسے اتنا خطرناک اور ڈراؤنا بنا دیا گیا ہے ۔ کہ اس کے بھیانک راستے پر ٹھوکر کھائے بغیر دو قدم نہیں چلا جاتا ۔

جس مذہب نے مذاہب عالم کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا ۔ آج اس کے نام لیواؤں کے لئے دوسرے مذاہب کے سایہ میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا ۔ جس کے دسترخوان پر ایک دنیا پلتی رہی آج اس کے افراد دوسروں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں ۔ اور جس نے تعلیم و تہذیب کی روشنی سے ایک عالم کو منوّر کیا ۔ آج اس کا گھر جہالت کی ظلمتوں میں جگنو کی چمک کے لئے ترس رہا ہے ۔

اب بھی اگر تم مرد کی شرمناک ذہنیّت پر پردہ ڈالے ہوئے مجبور بے گناہ عورت کو الزام دیے جاؤ ۔ تو تمہاری بے بصیرتی میں کیا کلام ہو سکتا ہے ۔

چوتھا خط

اس خط میں تم نے پردہ نسواں اور تعلیم نسواں کے متعلق ایک نئی بحث کا آغاز کیا ہے۔ یہ بحث نہایت طویل ہے۔ اور وقت طلب! میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ تعلیم سے بے بہرہ اور پردہ کی قید میں عورت کے حقوق کہاں تک پامال ہوئے۔ کیوں کہ اس کے متعلق میں کئی جگہ مذکور کر چکا ہوں۔ یہاں میں تمہیں صرف یہ بتاؤں گا کہ ہماری یہ قبیح پابندیاں خود ہمارے لئے کس حد تک نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ اور عورت کی جہالت و قفس زدہ زندگی ہماری آئندہ نسلوں کے لئے کس درجہ مضرت رسا اور تخریبی صورت اختیار کر چکی ہے۔ میں اس بیان کو مندرجہ ذیل تین حصص میں تفصیل کے ساتھ لکھتا ہوں۔

(۱) عورت کی جاہلانہ اور محدود زندگی میں جب ہماری بڑھتی

ہوئی مہذب طبیعتوں کے لئے کوئی دلکشی اور دلچسپی باقی نہ رہی تو ہم مجبوراً درپردہ اور کھلم کھلا معصیت کاری سے اپنی تسکین خاطر کرنے لگے۔ قوم میں بدکاری کی وبا بڑھتی گئی۔ اس کا روپیہ، وقت اور طاقت زائل ہوتی گئی۔ اور وہ آج ایک عضو ناکارہ ہوکر رہ گئی ہے۔

(۲) عورت پر یہ پابندیاں لگا کر ہم نے اپنی نصف قوت تباہ کر دی۔ اپنا ایک بازو کاٹ دیا۔ اور اپنی تعداد کا ایک کثیر حصہ معطل اور بیکار کر کے اسے اُلٹا اپنے لئے بوجھ بنا دیا۔ ورنہ بصورت دیگر وہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے دوش بدوش کام کرنے کے ہر طرح اہل ہوتی اور ہر صعوبت میں ہماری شریک کار و معاون!

چنانچہ ہماری اس حماقت کا لازمی طور پر یہ اثر پڑا۔ کہ ہم مفلوک الحالی اور غربت و تنگدستی کے چکر میں پھنس گئے۔ ہماری کمزوری اور بے مائیگی نے ہماری ذہنیت کو پست اور غلامانہ کر دیا۔ اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

(۳) بچوں کی تربیت کا پہلا گہوارہ آغوش مادر ہے۔ عورت

کو بچوّں کی تعلیم و تربیت اور ان کے مستقبل کی تعمیر و تخریب میں بہت بڑا دخل ہے۔ اور ان کی ابتدائی تربیت کے نقوش ان کی معصوم ذہنیّت میں پختہ ہو کر ان کے کردار زندگی کے ضامن بن جاتے ہیں۔

ہماری عورتیں غیر تعلیم یافتہ اور گھر کی چار دیواری میں مقید رہ کر دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی زندگی اور تعلیم و تربیت کے جدید اصولوں سے قطعی ناآشنا اور اپنے فرسودہ مکروہ رسم و رواج کی لعنت میں مبتلا رہیں۔

بچوّں کی تربیت ان سے خاک ہوتی۔ چونکہ خود تعلیم یافتہ نہ تھیں اس لئے تعلیم کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ سائنس کو شیطانی علم بتا کر بچوّں کو اس سے نفرت دلائی۔ عہدِ عتیق کے رسوم، عقائد کا انہیں پابند بنایا۔ تقدیر اور قناعت کا درس دیا۔ رہبانیت اور مذہبی تعصب سے ان کی پاک ذہنیّت کو خراب کیا۔ غلامانہ شعائر کا انہیں پابند کیا۔ اور ان کے دلوں میں عمل و کردار کی روح کو فنا کر دیا۔

جب یہ نسلیں بڑھ کر جوان ہوئیں اور اُنہوں نے زمام وقت سنبھالی۔ تو ان کے جوہر مٹ چکے تھے۔ اور وہ سوائے حیوانوں کی طرح کسی بالا طاقت سے ہانکے جانے کے کچھ بھی نہ کر سکتے

تھے۔ وہ زندہ لاشیں تھیں۔ بے عمل جماعت تھی۔ اشتراک و تعاون کے دشمن تھے۔ تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ سائنس سے نا آشنا اور سلطنت و حکومت کی ذمہ داری اٹھانے کے نااہل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غلامی کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ قوم اور زیادہ پستی میں گر گئی۔ ملک میں پہلے سے کہیں زیادہ ذلت و نکبت کا دور دورہ ہوا۔ اور ہم آزادی کی منزل سے کوسوں دور جا پڑے۔

یہ ہے وہ اجتماعی نقصان عظیم جو عورت کی جہالت اور قیود پردہ کی وجہ سے ہمیں ذاتی طور پر اُٹھانا پڑا۔ اب اگر اس کے بعد بھی تمہارے جیسے بے مغز انسان اپنی ہٹ دھرمی اور کج بحثی پہ اڑے رہیں۔ تو جو اس کا مآل ہوگا۔ وہ ظاہر ہے۔ یعنی بہت جلد صفحۂ ہستی سے ہمارا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ ہمارے اُبھرنے کا امکان تک نہیں رہے گا۔ اور تاریخ کے صفحات میں ہماری یہ خودکشی ہماری جہالت اور حماقت کے باعث ہمیشہ کے لئے یادگار رہے گی۔

میری اس پیش گوئی کو افسانوی چیز نہ سمجھو۔ بلکہ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ زمانہ ترقی پسند ہے اور اس کی رفتارِ ترقی میں جہالت کا کوئی روڑا بھی زیادہ دیر تک نہیں اٹکا رہ سکتا۔

پانچواں خط

ضبط تولید کا میں واقعی حامی ہوں۔ کیا کہا "یہ چیز ی آزاد خیالی کے منافی ہے"۔

دوست! تم سے قدرت عقل سلیم ہی واپس لے چکی ہے۔ تو اب میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایک سیدھی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہ آسکے تو اس میں میرا کیا قصور!

ہندوستان کی موجودہ بڑھتی ہوئی مفلوک الحالی کو دیکھو اور پھر سوچو کہ بچہ کشی اس کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتی ہے۔ آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار نے ملک میں بے روزگاری کی وبا پھیلائی اور معاشی مشکلات نے اختلاط میں اضافہ کیا۔ جس کے باعث آبادی بڑھتی گئی اور بڑھتی جا رہی ہے۔ پرورش۔ تربیت کا افلاس و غربت کی وجہ سے کوئی ذریعہ نہیں تعلیم و تہذیب کے حصول کی استعداد نہیں۔ ناچار کچھ

بیکار۔ بے روزگار مارے مارے پھرے۔ کچھ نے کسب و ہُنر سیکھا۔ تعلیم تو تھی ہی نہیں۔ کسی ہُنر میں درجۂ کمال کیا حاصل کرتے! بمشکل تمام دن بھر کی کڑی محنت و مزدوری سے پیٹ پالنے کا سہارا ہُوا۔ لیکن آخر وہ بھی کب تک۔ ہر کسب و ہُنر کے کرنے والوں کی تعداد جب حد سے تجاوز کر گئی تو محنتانہ میں کمی ہوتے ہوتے نفی کے برابر رہ گیا۔ اور اس طرح مزدور کے لئے بھرنا پیٹ بھی مُشکل ہو گیا۔ آخر تنگ آکر بہتیروں بے روزگاری کو ایسے روزگار پر ترجیح دی۔ بہتیروں کے لئے خود بخود روزگار کے دروازے مسدود ہو گئے۔ فاقہ کشی پر نوبت پہنچی زندگی وبال جان نظر آنے لگی۔ چوری۔ راہزنی اور لوٹ مار کی وارداتیں عام ہوئیں۔ اور جرائم کی کثرت نے ملک کا نظام سکون برباد کر ڈالا۔

ضبط تولید کے یہ معنی نہیں۔ کہ بچے پیدا ہی نہ کئے جائیں بلکہ اس سے مُراد یہ ہے کہ ہم جو شادی کے بعد اپنی بضاعت و استعداد کا اندازہ نہ کرتے ہُوئے بچہ کشی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا انسداد کیا جائے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ محض بچہ کشی ہی انسان کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بچوں

کی تعلیم و تربیت کا جو بوجھ اور ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے اسے کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ تم ہی انصاف سے کہو۔ کہ اگر ایک تیس روپے ماہوار آمدن کا شخص شادی کرے تو میاں بیوی کا گذارہ اس حقیر رقم میں کس قدر تنگی سے چلے گا۔ پھر اگر اس پر ایک آدھ بچہ ہو جائے۔ تو ان کی مشکلات میں اور زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ تاہم اگر وہ بہت زیادہ خساست سے کام لیں اور اپنا گذارہ چلا سکیں تو کسی حد تک قرین قیاس ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اس پر بھی بس نہ کرتے ہوئے وہ پانچ چھ بچے پیدا کر لیں تو ان کی قابل رحم حالت کا تصور بھی کتنا روح فرسا ہوگا۔ وہ اگر بچوں کو ذلیل سے ذلیل لباس اور خوراک بھی بہم پہنچائے تو بھی ہرگز متحمل نہیں ہو سکے گا۔ اور جب وہ انہیں لباس و خوراک مہیا نہ کر سکا۔ تو ان کی تعلیم و تربیت کیا کرے گا۔ وہ ان کی زندگی کیا بنائے گا۔ وہ یونہی آوارہ اور دربدر پھرا کریں گے۔ جرائم کی فضا میں پروان چڑھیں گے۔ بدکرداری اور بدفعلی میں پڑ کر اپنی زندگی برباد کریں گے۔ اور اس طرح نہ صرف ان کی زندگی برباد ہوگی بلکہ اس متعدی مرض سے ملک پر بھی اثر پڑے گا

اور رفتہ رفتہ قوم کی قوم اس تباہ کن عارضہ میں مبتلا ہو کر مٹ جائے گی۔ ان کا وجود تک نہیں رہے گا۔ اور اگر ان دائمی مریضوں سے کوئی نسل چلی بھی تو اپاہج، لولے، لنگڑے اور ننگ انسانیت جن کا وجود و عدم وجود برابر!

یہ ہے تمہارے الفاظ ہیں میری افسوسناک ذہنیت کا تضاد جس پر مجھے فخر ہے۔ اور جس کی اشاعت کو میں اپنی زندگی کا مقصد وحید خیال کرتا ہوں۔ یہاں پر میرے ایک دوست ہیں جن کے علم و فضل میں کلام نہیں ہو سکتا۔ اور آزاد روش اتنے کہ ہمیشہ مذہبی احکامات و معتقدات کو سائنس و فلسفہ کی روشنی میں دیکھنے اور عقل و خرد کی کسوٹی پہ پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن خانگی معاشرت میں ان کی یہ تمام بلند ذوقی انتہائی پستی اختیار کر لیتی ہے۔

آپ کی شادی والدین نے نہایت کم سنی میں کر دی۔ اس لئے اب اپنے شامت اعمال کے باعث چھ بچوں کے باپ ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ سلسلہ منقطع کرنا نہیں چاہتے۔ ان کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے اہلیہ محترمہ کسی نسائی عارضہ میں مبتلا ہے۔ اور اس لئے اسے تین چار ماہ سے

زیادہ حمل نہیں ٹھہر سکتا۔

ہر حمل کے گرنے پر اس بیچاری کو پانچ چھ ماہ تک شدید بیماری کا کورس ختم کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی صحت حد درجہ گر چکی ہے۔ ہر بیماری میں آپ کا چار پانچ سو روپیہ معالجہ پر صرف ہو جاتا ہے۔ اور مریضہ موت کے مُنہ سے لوٹ کر آتی ہے۔ یہ سلسلہ چار سال سے متواتر جاری ہے۔ اس ذات شریف کو بارہا سمجھایا ہے۔ کہ اس "شرعی معصیت" سے باز آؤ۔ یا کوئی مانع حمل ادویہ استعمال کرو تاکہ تم مالی نقصان اور وہ عفیفہ جانی عذاب سے محفوظ رہے۔ لیکن وہ تو اس کی جان لینے پر تُلے ہُوئے ہیں۔ ان کا تو دلی مقصد ہی یہ ہے۔ کہ اس سے نجات ملے اور دوسری دوشیزہ گھر لائیں۔ چنانچہ ہماری ایک نہیں سُنتے اور انتہائی مذہب دشمنی کے باوجود ہمیشہ ایسے موقع پر عذر لنگ پیش کر دیتے ہیں۔ کہ ہر سال ایک نفس کا خون سر لینا سخت گناہ ہے۔ لیجئے صاحب! آپ کی ذہنیت ملاحظہ ہو۔ گویا موجودہ صورت میں ہر سال ایک خون نہیں ہو رہا۔ اور اس کی ذمہ داری آپ کے سر نہیں۔

یہ سب کچھ وہ خود بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور ایسے آدمی

کے ساتھ سر کھپانا لایعنی ہے۔ لیکن مرد کی آنکھوں پر جب خودغرضی کی شہوانی پٹی بندھ جاتی ہے۔ تو اسے تصویر کا دوسرا رُخ نظر نہیں آتا۔

چھٹا خط

میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم نے عورت کے خلاف یہ جہاد کیوں شروع کر رکھا ہے۔ اگر محض میرے چھیڑنے کو یہ گناہ مول لے رہے ہو تو تم سے زیادہ بے وقوف کون ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورت کے متعلق اس قدر مکروہ ذہنیت تمہاری نہیں ہو سکتی جیسا کہ تمہارے خطوط سے ظاہر ہے۔ تم تو طبقہ ذکور کے وکیل کی حیثیت سے جا و بیجا اعتراضات کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ اور آخر آج تم نے مجھے مرد ہوتے ہوئے عورت کی حمایت کرنے کا طعن بھی دے دیا۔ لیکن میں عدالت انسانیت میں محض عدل و انصاف کے نام پر عورت کے لئے اپیل کر رہا ہوں۔ میں اس تعصب و فرقہ داری سے کوسوں دور ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اتنا عرصہ کی رسم و راہ کے باوجود تم نے اب تک مجھے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اور

میرے متعلق شدید غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ میری ذہنیت اتنی سادہ اور پاک ہے۔ کہ اگر آج تم میری کسی غلطی کا مجھے اعتماد دلا دو تو مجھے اس کے اعتراف میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔

میں اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ایک مختصر سوال کا جواب تم سے چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر تم عورت کو مرد کے مساوی حقوق لینے کا اہل نہیں سمجھتے، اور اس میں کمزوری پاتے ہو تو عورت کے بغیر زندگی گذار کر دیکھو۔ عورت کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور منزل حیات کو تن تنہا طے کرو۔ اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ اور دیکھو کہ وہ تمہارے سوا نہیں جی سکتی۔ یا تمہارا اس کے بغیر زندہ رہنا محال ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس طرح اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آئندہ کے لئے تمہاری نسل بھی قطع ہو کر رہ جائے گی۔ پس اگر ہم ایک دوسرے کا تعاون نہ ہونے کی صورت میں زندہ رہنے کے قابل ہی نہیں ہیں تو ہم سے کسی ایک کو دوسرے پر تفوق کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔ اور مرد کی عورت پر یہ بزرگی و فضیلت کیا معنی رکھتی ہے۔ عورت کو مساوی حقوق کیوں نہ دیئے جائیں۔ اور تمدن و معاشرت میں وہ برابر کی حصہ دار کیوں نہ

ہو۔

اب تمہیں عورت کے حقوق پامال کرنے کا احساس نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو اس پر بیت رہی ہے۔ وہ تم کیونکر جانو۔ لیکن اگر ذراسی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے عالم خیال میں ایسے زمانے کا تصوّر کر لو۔ جس میں مرد عورتوں کی طرح گھروں میں محبوس ہوں۔ اور عورتیں مردوں کی طرح آزاد! مرد کے لئے گھر سے بے پردہ نکلنا منع ہو۔ اس کی تعلیم ناجائز ہو۔ اس کے لئے تہذیب۔ فیشن اور آزادی گناہ ہو۔ وہ اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں خود مختار نہ ہو۔ بچوں کی پرورش اور گھر کا تمام دھندا اس کے ذمہ ہو۔ عورت کی دلداری اور خدمت گزاری اس کا نصب العین ہو، دنیا کی دلچسپیوں اور لوازمات سے اس کی پرہیز ہو۔ سیر و تفریح سے اسے روکا جائے۔ آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ رائے کی اسے اجازت نہ ہو۔ قدم قدم پر اس کے لئے دھوکا اور فریب ہو۔ اس کا خلوص محبت کچلا جا رہا ہو۔ اس کی وفا شعاری ٹھکرائی جا رہی ہو۔ درندوں کی طرح خود ہی اس کی عصمت و عفت لوٹ کر اسے اپنے قانون کے ذریعہ راندۂ درگاہ بنا دیا

جاتا ہو۔ اس کی تجارت ہو رہی ہو۔ وہ صرف عورت کے رحم و کرم پر ہو۔ شادی کے بعد وہ عورت کی ملکیت سمجھا جاتا ہو۔ عورت کئی کئی شادیوں کے لئے مختار ہو۔ لیکن اس کی زندگی ایک شادی کیا ایک دفعہ کی صحبت کے بعد ختم سمجھی جاتی ہو۔ اسے ایک دفعہ شادی کر لینے کے بعد سوائے موت کے کسی دوسرے قانون کی رو سے عورت کے چنگل سے چھٹکارا حاصل نہ ہو سکتا ہو۔

غرضیکہ وہ عورت کے ترکش کے ہر پیکان کا ہدف بنا ہوا ہو اور جس قدر مکروہ سلوک آج عورت کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ وہی اور بعینہٖ برتاؤ اس کے ساتھ ہو رہا ہو۔ پھر دیکھو کہ تم اسے کیونکر برداشت کرتے ہو۔ اور سوچو۔ کہ جس سلوک کو تم اپنے لئے ناجائز سمجھتے ہو۔ وہ دوسروں کے لئے کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک حکیم دوست سے "تجزیۂ جنسی" کے موضوع پر بحث چھڑ گئی تھی۔ وہ حضرت طبی نقطہ نظر سے ہر چند ایڑی چوٹی کا زور لگا کر مرد کا تفوق ثابت کرنے کی سعی کرتے رہے۔ لیکن آخر انہیں میری اس ترجیح کے

آگے جھکنا ہی پڑا۔ کہ عورت کا زچگی کے باعث مرد سے افضل ہونا قرین قیاس ہے اور بقائے نسل انسانی کے لئے مرد کی نسبت عورت کے وجود کی اہمیت غالب ہے ٭

انشاء پریس لاہور